

رجسٹرڈ نمبر ۷۸۱

# معارف

مجلس اراستہ کا ماہوار علمی سالانہ  
مترجمہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ مع محصول

— ۳۰ —

مطبع معارف میں چھپکے

دفتر دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا



# کتابخانہ دار المصنفین

علامہ شبلی نعمانی

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد اول، جلد دوم، غیر مجلد  
 سیرۃ النبی، جلد دوم، قسم اول، قسم دوم، قسم سوم، قسم چہارم  
 الفاروق حضرت فاروق اعظم کی الفت، طرز حکایت  
 الغزالی، امام غزالی کی سوانح عمری اور کافلسفہ  
 المامون خلیفہ مامون الرشید عباسی کے حالات  
 شعراجم حصہ اول شاعری کی حقیقت فارسی  
 شاعری کا آغاز و قدما کا دور و سیرت  
 حصہ دوم شعرا کے عہد متوسط  
 حصہ سوم شعرا کے متاخرین  
 حصہ چہارم فارسی شاعری پر ریویو  
 حصہ پنجم قسم اول، قسم دوم  
 مقالات شبلی پندرہ علمی و تاریخی مضامین کا مجموعہ  
 الانتقاد علی التمدن اسلامی، جرجی زیدان کے  
 تمدن اسلامی پر عربی میں ریویو  
 تذکرہ خسرو یعنی امیر خسرو کے حالات اور ان کی  
 شاعری، ماخوذ از شعراجم  
 مضامین عالمگیر شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر  
 اعتراضات اور اسکے جوابات  
 مکاتیب شبلی مولانا کے مرحوم کے خطوط کا مجموعہ جو علمی  
 ادبی، اخلاقی، معلومات کا خزانہ ہے، جلد اول، جلد دوم، جلد سوم

دست گل مولانا کی فارسی غزلوں کا مجموعہ  
 برگ گل، مولانا کے آخری زمانہ کے فارسی  
 قصائد اور غزلوں کا مجموعہ  
 قصیدۂ امرتسر، امرتسر کے اجلاس مذاکرۃ العلماء میں  
 دلائل نے جو فارسی قصیدہ پڑھا تھا، طبع نیکین، علی  
 مجموعہ کلام شبلی اردو  
 مشنوی صبح امید اردو  
 نوٹہ اسحاقی مولانا کا اپنے بھائی کی فات پر پڑھ کر  
 مولانا حمید الدین صاحب بیانی  
 تفسیر سورہ تحریم جدید طرز پر عربی میں آن مجید کی تفسیر  
 تفسیر سورہ قیامہ  
 تفسیر سورہ دانش  
 تفسیر سورہ واکفرون  
 تفسیر سورہ والعصر  
 اسباق النخوسل طرز پر عربی گرائمر اردو  
 دیوان حمید مولانا کا فارسی دیوان مع تصویر  
 خرد نامہ منظوم و خالص فارسی بان میں اشعار کی مجموعہ  
 تحفہ الاعراب عربی کی شجہ بدیعہ دو نظم میں  
 دیوان النبیض  
 ہندوستان کے مایہ ناز استاد ادب لانا فیض حسن پوری  
 کا عربی کلام صفحہ ۸۲  
 بدیع گوئی، شجہ بدیعہ کے دیکھ چلا لاتی قیمت

جلد پنجم

ماہ جنوری سنہ ۱۳۵۰ مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۰

عدد اول

## مضامین

- (۱) شذرات ۲-۴
- (۲) سورہ یوسف کی گذشتہ تفسیر پر نقد و استدراک، جناب مولانا حبیب الرحمن شروانی، ۱۴-۱۳
- (۳) عہد اسلامی میں ہندوستان کی جہاز رانی، جناب محمد یوسف صدیقی ایم بی آر ایس، ۱۵-۲۴
- (۴) مسئلہ زر، مفتی مقبول احمد صاحب رئیس مندیہ، ۲۵-۲۵
- (۵) چارلس ڈارون، مولوی محمد سعید صاحب انصاری، ۳۶-۲۴
- (۶) محمد تعلق کا دور حکومت، پروفیسر گارڈن براؤن، ۴۵-۵۴
- (۷) مذہب و اصلاح نظام تمدن، ۵۸-۶۵
- (۸) اخبار علیہ، ۶۶-۶۹
- (۹) ادبیات، ۷۰-۷۱
- (۱۰) تقریط و تنقاد، مولوی عبد العلی ندوی بی ایس سی، ۷۲-۷۸
- (۱۱) مطبوعات جدیدہ، ۷۹-۸۰

## جدید مطبوعات

سیرۃ عمر بن عبد العزیز، خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی سوانح عمری، ان کے مجددانہ کارنامے،  
 بنو امیہ کی تاریخ و طرز سیاست کی تفصیل اور ان کے معائب و محاسن کا موازنہ، از مولانا عبد السلام ندوی۔  
 قیمت ۸۰

محمد ابراہیم صاحب شریف خانی، معیار الصحیح، اصول و فنون صحیح پختہ کی کتاب



## شَدَا

ٹائمز لٹری سلیمنٹ کے ایک ریویو سے معلوم ہوا کہ حال میں ایک نو مسلم فرینچ میوڈینا اور ایک آبا کی سلمان سیماں بن ابراہیم نے مشترک محنت سے انگریزی میں سیرۃ نبوی پر ایک ضخیم کتاب تالیف کی ہے چکا پورا نام "الف آف محمدی پرائٹ آف اللہ" (سیرت محمد رسول اللہ) ہے کتاب کی ارزان ایڈیشن کی قیمت ۳ پونڈ ۲ شلنگ (۴۰ روپیہ) اور نفیس ایڈیشن کی قیمت ۸ پونڈ ۲ شلنگ (سور و پیہ سے کچھ اوپر) ہے، اس گران قیمتی کا سبب غالباً یہ ہے کہ کتاب میں مسلمانوں کا نظام تمدن و طرز معاشرت دکھانے کے لئے تصاویر کثرت سے دی گئی ہیں، ٹائمز کے ریویو نگار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انداز تحریر میں تاثر مذاق قدیم کی پیردی کی گئی ہے، اور زمانہ محال کی ضروریات و مقتضیات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو کیا منقوی و معقوی حیثیات کی جامعیت کا امتیاز صرف علامہ شبلی مرحوم کی سیرت کو حاصل رہیگا؟ کتاب فرانس میں پیرس بک کلب کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

شہر مشرق پر دھیسرای، جی، براؤن، مشرقی علم و ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہیں اسکا حال سب کو معلوم ہے، حال میں لکھنؤ کے ایک ہونہار نوجوان تکمیل تعلیم کی غرض سے کیمبرج گئے ہیں وہ اپنے ایک پرائیوٹ خط میں اس نامور مشرق کا کچھ تذکرہ کرتے ہیں جو امید ہے کہ اکثر ناظرین کیلئے دلچسپ ثابت ہو، وہ کہتے ہیں :-

"میں نے پروفیسر براؤن سے درخواست کی کہ وہ گب موریل سیریز کے مطبوعات دارالمصنفین کو

بھیجے، زمین، غالباً آپ بھی اسے پسند کریں اور دارالمصنفین کے مطبوعات انکے پاس بھجوائیں، براؤن بالکل مجذب و متشخص ہیں، میں پرسوں انکے پاس گیا تھا اس غرض سے کہ اپنا عربی کا امتحان کراؤن تاکہ داخلہ کے امتحان سے جلد نجات ہو جائے، مگر وہ اپنی قوت گویائی کے آگے دوسرے کی سماعت نہیں کرتے، اور موضوع اس قدر جلد بدل جاتا ہے کہ برابر سلسلہ جاری ہی رہتا ہے، کئی بار عرض کیا کہ کوشش کی مگر جواب میں البیرونی کے کارنامے، ابن باجر کے کمالات اور مسئلہ دوران خون پر ایک کچر سننا پڑا۔۔۔۔۔ موصوف نے مجھے دو کتابوں کے نام دیئے ہیں کہ ہندوستان کے کتب خانوں میں انہیں تلاش کرو اگر انکی اصل مستعار مل سکے تو فیہا در نہ انکی نقل یا فوٹو حاصل کئے جائیں گے :-

(۱) الحاوی لابن محمد زکریا الرازی،

(۲) فردوس الحکمہ لعلی بن رہان الطبری

یہ طب کی کتابیں ہیں، براؤن آجکل مشرق کی طبیعات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں وہ بیان کے

ایم، ڈی، مین اسٹے طب میں بھی کافی استعداد رکھتے ہونگے :-

انگلستان کا سب سے زیادہ معزز ماہوار رسالہ نائٹینگھم سگری ہے جو چالیس سال سے زائد علم و فن، ادب و سیاست کی نہایت سنجیدہ خدمات ادا کر رہا ہے، اور جسکے مضمون نگاروں کی فہرست میں ہمیشہ انگلستان کے مشاہیر عصر کیلئے، ٹنڈل، گلیڈ اسٹن، لارڈ ٹینسن وغیرہ کے نام نظر آتے رہے ہیں حال میں اسکی عنان اوارت ڈیوک آف نارٹمبر لینڈ کے ہاتھ میں آئی ہے جو ولایت کے نامور رئیس ہیں، کیا ہماری قوم کے کسی نواب یا راجہ سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زبان کے کسی سنجیدہ پرچہ کے فرائض ادا رت کو ایک لمحہ کے لئے بھی سنبھال سکیگا؟



ڈاکٹر بلیم ڈی "اف آر سی بی" اس وقت برطانیہ کے ایک مستند ماہر طب مغربی ہیں، چند روز ہوئے انھوں نے سرطان کے علاج پر ایک کتاب شائع کی ہے، جس میں شواہد کی کثرت اور دلائل کی قوت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ مرض سرطان کا علاج اپریشن (عمل جراحی) کے ذریعہ سے ایک مہل و نامعقول طریق علاج ہے، اسلئے کہ اس مرض کا اصل سبب فساد خون ہے اور وہ جب تک دفع نہ کیا جائیگا اسکے مادی مظہر کو شگاف دینا ہی نہیں کہ قطعاً بے اثر رہیگا بلکہ اس طریق سے زہر براہر پہلتا رہیگا، تاآنکہ مریض کا خاتمہ ہو جائیگا، ڈاکٹر موصوف نے اس مسئلہ پر محض نظری استدلالی حیثیت سے بحث نہیں کی ہے بلکہ کثرت سے واقعات و اعداد فراہم کر کے یہ دکھایا ہے کہ کسی مریض کو اس طریقہ علاج سے شفا ہوئی ہی نہیں، طب یونانی کے خدشہ گردوں نے آج تک جب کبھی اس قسم کی لب کشائی کی جرات کی ہے تو ہمیشہ اس کا جواب جندہ تحقیر سے دیا گیا ہے، دیکھنا ہی کہ قوم آذر اس تیشہ خلیل کا کیونکر مقابلہ کر سکتی ہے؟

—\*—

لکھنؤ یونیورسٹی کا قیام ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، لکھنؤ یونیورسٹی نہ صرف اودھ کو تعلیمی "ہوم رول" دلائیگی بلکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کے لئے ایک بالکل نادر شے ہوگی، اساتذہ کا تقرر اور تعلیم و تدریس کے اصلی فرائض تمام تر یونیورسٹی کے ذمہ رہیں گے، کالجوں کی حیثیت محض ہوسٹل یا دارالافتاء کی رہ جائیگی، طلبہ بجائے اپنے گھروں پر رہنے کے انہیں کالجوں میں مقیم رہیں گے، باہر کی کوئی درس گاہ ملحق نہ ہو سکیگی، کالجوں سے ایف، اے کی جامعیت نکال دی جائیگی، بی۔ اے کی مدت تعلیم بجائے دو سال کے تین سال ہو جائیگی، غرض اس قسم کے بیسیوں تغیرات ہونگے جن سے ہندوستان اب تک نا آشنا تھا، ملک منتظر رہیگا کہ یہ جدید تجربات کس حد تک مفید و کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

—\*—

کمالات علم و ادب کے اعتراف کے لئے اس وقت یورپ کے ہاتھ میں سب سے بڑا مادی صلہ ٹوبل پرائز ہے، جس کا ہر انعام ایک ایک لاکھ روپیہ سے اوپر کا ہے اور جس کا فیصلہ ہالینڈ میں ایک کمیٹی کرتی ہے، جس میں یورپ کی ہر قوم کے کالمین فن کی نیابت موجود ہے، حال میں اسکے انعامات بابت سائنس کا اعلان ہوا ہے، طبیعیات میں مسئلہ کا ٹوبل پرائز پر دینیسر پلینک (برلن یونیورسٹی) کو، اور مسئلہ کا پر دینیسر اسٹارک (گریٹوڈ یونیورسٹی) کو، اور کیمیا میں مسئلہ کا پر دینیسر ہیبرا (برلن یونیورسٹی) کو ملا ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں اشخاص جرمن ہیں، یا کم از کم جرمن یونیورسٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں، ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک بار ایک انکا جموطن بھی اس اعزاز کا مستحق قرار پا چکا ہے، (رابندر ناتھ ٹیگور)

—\*—

انگلستان میں ریشلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلیوں) مدت سے قائم ہے، جس کی کنیت کا اصل الاصل یہ ہے کہ عقل کو نقل پر، دلیل کو عقیدہ پر، درایت کو روایت پر مقدم سمجھا جائے، گو عملاً اس انجمن کے اکثر ارکان صرف مذہب کی مخالفت اپنا فرض سمجھتے ہیں، انجمن مذکور کے بعض ارکان اہل ہند بھی تھے، لیکن اب تک اس قسم کی کوئی مستقل انجمن ہندوستان میں نہ تھی، مگر اب چند ماہ ہوئے کہ اسی نمونہ پر ایک انجمن انڈین ریشلسٹک سوسائٹی کے نام سے کلکتہ میں بھی قائم ہوئی ہے، اور انجمن کی جانب سے ایک مختصر ماہانہ رسالہ بھی انگریزی میں نکلنے لگا ہے، انجمن کی مجلس انتظامی کے ارکان کلکتہ کے پیرسٹر و گریجویٹ وغیرہ ہیں، جن میں ایک صاحب سلمان ہیں، رسالہ مذکور کا اب تک صرف پہلا نمبر جاری نظر سے گذرا ہے، اسلئے انجمن کے طرز عمل کے متعلق کوئی رائے قطعیت کے ساتھ نہیں قائم ہو سکتی، تاہم انجمن اگر اپنے اصول کے اندر محدود ہے اور خواہ مخواہ اہل مذاہب سے انجمن اپنا فرض نہ قرار دے لے تو اس میں شبہ نہیں کہ اسکے لئے مفید کام کرنے کا بہت وسیع میدان موجود ہے، یہ دیکھ کر ایک حد تک اطمینان ہوتا ہے کہ انجمن کے سرپرست سر جان وڈرف مشہور جج ہائیکورٹ کلکتہ میں جو اپنی سنجیدگی



دست فطر، علم و فضل، بے نقبھی، رواداری کا اپنی تحریروں میں ایک سے زائد بار ثبوت دیکھنے میں امید رکھنا چاہیے کہ انکی رہنمائی میں پر جوش نوجوان ارکان انجمن اپنے حدود سے تجاوز نہ کریں گے۔

ہندوستان کے بعض خوش فہموں کے نزدیک تو شعر العجم، پروفیسر براؤن کی کتاب کا سرقہ ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود پروفیسر موصوف، شعر العجم سے اخذ و استناد کرتا ہے، مسٹر براؤن کے ایک ہونہار شاگرد اپنے تازہ عنایت نامہ میں لکھتے ہیں:-

”ٹریبی ہسٹری آف پریشیا کی تیسری جلد تقریباً شائع ہو گئی، اس کے پروف دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، شعر العجم سے بہت کچھ اخذ کیا گیا ہے، غالباً بشی پہلے ہندوستانی میں جنکی تعریف براؤن کی زبان سے نکلی ہے۔“

بعض حلقوں میں اس خبر سے جو شدید صدمہ پیدا ہوا ہوگا اس کا ہم اندازہ کر سکتے ہیں!



## مقالات

### تفسیر سورہ یوسف

پر

### استدراکات و تفادات

از جناب مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدر الصدور و دولت اصفیہ

رجع الآخر مسئلہ کے معارف میں ایک مضمون سورہ یوسف کی چند آیات کے متعلق شائع ہوا ہے مضمون بالا کے دو حصے ہیں، اول قدیم تفسیر کی متعلق جرحین، دوم خود مضمون نگار صاحب کی تفسیر میں دونوں حصوں کی بابت بحث کرنا چاہتا ہوں۔

حصہ اول میں حسب ذیل جرحین قدیم تفسیر پر کی گئی ہیں،

(۱) مکر کے معنی صحیح نہیں لئے گئے،

(۲) یہ تاویل صحیح نہیں کہ زمان مصر نے جیل طعن و اعتراض سے حضرت یوسف کو دیکھنا چاہا،

(۳) پہلے سے یہ یقین کر لینا ناممکن ہے کہ انسان مختل الحواس ہو کر کیا حرکت کرے لگیگا، اعجاز جمال دیکھنے کے لئے چھری ہاتھوں میں دینے کی ضرورت نہ تھی، یہ قرین قیاس نہیں کہ کہانے کے کاٹنے کے لئے چھریاں دی گئی ہوں تو ایک ہی وقت میں سب عورتیں کہانے میں مشغول ہو گئیں، مختلف الاحساس عورتوں کو ایک ہی اثر ہونا ضروری نہ تھا،

لے آیات مجملہ کے متعلق حسب ذیل تفاسیر کے مطالعہ کر کے بعد یہ مضمون لکھا گیا ہے، معالم التنزیل، بنو، معارج العنبر، رازی، نور التنزیل، بیضاوی، مدارک التنزیل، نسفی، جامع البیان، الدر المنثور، سیوطی، تفسیر ابن کثیر، تبصر الرحمن، مائمی، مغرب القرآن، نیساوری،



(۴) حسن و جمال کے نظارے سے ایسا مدہوش ہونا کہ انسان اپنے تئیں زخمی کر لے، ابتداء آفرینش سے آج تک بہنیں سنا گیا،

ان اعتراضوں کا سلسلہ اس عبارت پر ختم ہوا ہے کہ اس تفسیر میں عورتوں کے الزام کو اور ان کے ہاتھ کاٹنے کو جس شکل میں بیان کیا گیا ہے، غیر منصوص اور خلاف سیاق و سباق ہونے کے علاوہ سراسر غیر مربوط اور خلاف عقل ہے،

حصہ دوم کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ قرآن سے جو غالب گمان ہوتا ہے، متبادر ہوتا ہے، اس کے دلائل یہ ہیں،

اول حضرت یوسف کی دعا، دوم جن الفاظ میں زلیخا کے بہکانے کا ذکر ہے، ان میں تمام عورتوں کے فعل کا ذکر کیا گیا ہے، سوم فذلک الذی ملتی فیہ چارم ثم بلّام لما بعد وادوا الایات الخ پنجم حدیث شریف کے الفاظ انکن صواحب یوسف،

پہلے ہم ان اعتراضوں کا جواب دیتے ہیں جو قدیم تفسیر پر کئے گئے ہیں،

اولاً معنی کر کے، مفسرین نے تقریباً بالاتفاق لکھا ہے کہ اس مقام پر مکر کے معنی غیبت کے ہیں، امام العربیہ علامہ زمرشری بھی کشف میں یہی لکھتے ہیں، علامہ کے الفاظ یہ ہیں (بکھن) (اختیار میں) سو فاق

اس صورت میں صاحب مضمون کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہا، ان اس معنی کے بیان کرنے کے بعد ضمناً یہ پہلو بھی بیان کیا ہے کہ یہ ہی مراد ہو سکتی ہے کہ عورتوں نے اس ناحیانہ طعن کے پردے میں یہ رمز

رکھا ہو کہ طعن کے اثر سے متاثر ہو کر زلیخا یوسف علیہ السلام کو دکھلا دیگی، یہ ایک لطیف پیرایہ حصول مدعا کا تھا اور فطرت انسانی کے مطابق ہے، آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ طعن کے ذریعہ سے انسان مضطرب ہو کر

دل کی باتیں کہہ دیتا ہے، گو اہوں سے جرح جن جن پیرایوں میں کی جاتی ہے ان میں ایک موثر طریقہ یہ بھی اور تجربہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات گواہ طعن سے متاثر ہو کر دل کی بات کہہ ڈالتے ہیں، خلاصہ یہ کہ طعن کے

اثر سے انکار ممکن نہیں، اب رہا یہ اعتراض کہ یوسف علیہ السلام پردہ نشین نہ تھے، نہ زمان مصر میں ایسا پردہ ثابت ہے کہ وہ کھرکی سے بھی نہ جہانک سکیں نہ دروازہ سے تاک سکیں، اس اعتراض کے وقت اس امر کو پیش نظر نہیں رکھا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے پاس احترام سے رہتے تھے، ایکوی مثلاً سے انکی جلالت شان پائی جاتی ہے، امرار و نزار کے رہنے سہنے کا جو طریقہ پہلے متادہ لیا تھا کہ عامہ خلایق سے علحدہ قلعون اور بڑے بڑے مخلون میں رہتے تھے، عامہ خلایق کے سامنے بجز خاص خاص مواقع کے بہت کم ظاہر ہوتے تھے، خلفائے بنی عباس میں عرصہ تک یہی دستور رہا کہ دربار بھی پس پردہ بیٹھ کر کرتے تھے، حکم و احکام صاحب کے ذریعہ درباریوں تک پہنچتے تھے، مامون رشید نے اس رسم کو توڑا، اس حجاب و انزوا کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مخلوق فرمانرواؤں کے دیکھنے کی دل و جان سے شائق رہتی تھی، نواب کلب علیخان مرحوم کی سواری حالت صحت میں جب کبھی نکلا کرتی تھی تو تماشا یوں کے ٹٹ کے ٹٹ لگ جاتے تھے، سلطان عبدالحمید خان مرحوم کی جمعہ کی سواری یورپ و امریکہ سے سیاحوں کو کہنچ کہنچ کر قسطنطنیہ پہنچاتی تھی، اہل یورپ باوجود کوشش کے انکی تصویر کہنچے میں کامیاب نہ ہو سکے، یہ مثالیں اس زمانہ کی ہیں، خیال کرو اس وقت کو جب مصر میں ذراعنہ کا دور دورہ تھا جو خدائی کے دعوے رکھتے تھے، کیا انکے شاہزادے بے تکلف گلی کو چون بین مارے مارے پھرتے تھے، اور ایسی عام چیز تھے کہ انکے دیکھنے کو نہ کوئی شائق ہو سکتا تھا، اور نہ کسی کے دل میں انکے دید کی تمنا ہو سکتی تھی اس حفظ شان کے ساتھ ملاؤ اس واقعہ کو کہ حضرت یوسف کی جمال کی شہرت تمام مصر میں ہے، عزیز مصر کی عورت کا ان پر مفتون ہونے اور متاع ہوش ہار بیٹھنے کا چرچہ کو بکوس ہے، اس حالت میں زنان مصر کا شائق دیدار ہونا اور زمانہ اہانت سے ایک طعن کے لطیف پیرایہ میں حصول مدعا کی سبیل نکالنی کیا ایسا خلاف عقل امر ہے کہ اسکو لکھ کر مفسرین دائرہ عقل سے خارج ہو گئے، تھیں ٹرون میں نامور ایکٹ کر نیوالون کے دیکھنے کے شائق ہو کر بسا اوقات لوگ ہستی سے گذر جاتے ہیں، اور یہ دن رات کا مشاہدہ ہے،



علیٰ ہذا القیاس بہت سے شواہد مل سکتے ہیں،

خلاصہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حفظ مرتبہ جلالت شان، انکے سر بازار پھرنے کو مانع نہ تھا، شہرت حسن، آرزو سے دیدار پیدا کرنے کے لئے کافی تھی، ان دونوں باتوں کے پیش نظر رکھنے کے بعد مفسرین کا قول اعتراض سے پاک ہو جاتا ہے، اس پر قوی شہادت یہ ہے کہ ان کا قول سن کر زلیخا پر جو اثر ہوا ہوتا کہ پر شوکت دعوت کا سامان کر کے ان عورتوں کو بلایا اور یوسف علیہ السلام کو سامنے کر دیا، انھوں نے جو کما زلیخا نے (جو حسن و عشق کی رمز شناس تھی) سمجھا،

آن کس است اہل بشارت کہ اشارت دادند

ہاتھوں کے کاٹنے کے واقعہ پر جن جن پیرایوں اور پہلوؤں پر اعتراض ہے، وہ مفسرین کا مقبول قول نہیں، انکا مقبول قول یہ ہے کہ زلیخا نے سامان دعوت آراستہ کی، مہمانوں کے لئے تیکے جیتا کئے، کمانا یا میوہ کاٹنے کے لئے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دی، جب وہ کمانا یا میوہ کاٹ ہی رہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کو سامنے کر دیا، مہمان عورتیں انکو دیکھ کر بہت ہو گئیں گھبرا گئیں، چھری بجائے میوہ کے ہاتھوں پر چل گئی، وہ یہ نہیں کہتے کہ چھری اس لئے دی گئی تھی کہ دیکھ کر بات کاٹ ڈالیں گی، اگر ایسا ہوتا تو صاحب مضمون کے اعتراضات وارد ہو سکتے تھے، بعض مفسرین نے یہ پیرایہ اختیار کیا ہے لیکن وہ بھی ضعیف کر کے، بہر حال قول مقبول وہی ہے جو اوپر بیان ہوا، اور اس پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ رہا یہ امر کہ حسن سے عورتوں کا متاثر ہو کر ہاتھ کاٹ لینا بالکل خلاف قیاس ہے اور ابتداء آفرینش سے آج تک ایسا نہیں سنا گیا۔

اسکا معمولی جواب تو یہ ہے کہ غالباً ہر شخص پر یہ واقعہ گذرا ہوگا کہ چاقو سے قلم بنارہا ہے یا کوئی اور چیز کا رٹ رہا ہے کہ خیال دوسری طرف منتقل ہو گیا، اور چاقو سے ہاتھ کٹ گیا، اگر ایسا ہی اس وقت بھی ہوا ہو کہ سب عورتیں حضرت یوسف کو دیکھ کر انکے دیکھنے میں مصروف و محو ہو گئی ہوں اور بجائے

تنبیج کے انکے ہاتھ میں چھری لگ گئی ہو تو کون امر خلاف قیاس ہے، یہ تو چھری سے ہاتھ میں زخم بھجنا تھا لوگ دلولہ محبت میں کنوؤں میں گر کر اگلا کاٹ کر زہر کھا کر جان دیدیتے ہیں، یہ روزمرہ کے واقعات ہیں جہاں چاہو کو توالی کی خبروں میں دیکھ لو،

شیخ علی حزمین نے اپنی سرگزشت میں شیراز کا چشم دید واقعہ لکھا ہے کہ ایک درویش سر بازار بیخودی عشق کی حالت میں اپنے جسم پر بے تکلف چھری کے زخم مارتا تھا، اور زخم کے لگنے پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس سے لذت یاب ہو رہا ہے، شیخ کو رحم آیا اور لوگوں کو ملامت کی کہ کیوں چھری اسکے ہاتھ سے نہیں لے لیتے، جواب ملا کہ چند بار کوشش کی، ہر بار حالت عجز و اضطراب مشاہدہ ہوئی چھری ہاتھ سے نکلی کہ جان بدن سے نکلی، مجبوراً چھڑ دیا، چند روز تک یہ عالم رہا، آخر ایک بار چھری پیٹ پر پڑ گئی، آمین کٹ گئیں اور کام تمام ہو گیا،

حضرت یوسف کا جمال بالکمال احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس کمال جمال کے ساتھ نور نبوت و عفت کی لمعان، اور عورتوں کا پہلے سے مشتاق دید ہونا، اس حالت میں دفعۃً دیکھنے پر اگر عورتوں کی چھریاں بجائے میوہ کے ہاتھوں پر چل گئیں تو کون استعجاب ہوا، یہ داستان بہت طویل ہو سکتی ہے لیکن ادب مانع ہے، معمولی بوالہوسی میں گل کمانا روزمرہ کی بات ہے، رہا یہ امر قرین قیاس نہیں کہ چھری سے کمانے کی چیزیں سب نے ایک ساتھ شروع کی ہو، بالخصوص اس وقت جب حضرت یوسف علیہ السلام انکے سامنے آئے، ایسے امر کو جو روزمرہ کا مشاہدہ ہے، خلاف قیاس کہنا حیرت افزا ہے میز پر سر روز مشاہدہ ہوتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز ہر مہمان کے سامنے ہوتی ہے اور وہ اسکے کمانے میں مصروف ہوتے ہیں، میوہ ایک ہی وقت میں کھاتے ہوتے ہیں، ایشیا کی طرز میں کمانا جب سب کے سامنے چن جاتا ہے تو بسم اللہ کہہ کر اجازت دیدی جاتی ہے، تب کمانا شروع کرتے ہیں مشادی کی محفلوں میں گھنٹوں مہمان اجازت کی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، عموماً کمانے کے بعد میوہ کھایا جاتا ہے،



اور حمان اسکے کمانے میں مصروف ہوتے ہیں، پشاد کی دعوتوں کا یہ سمان آج تک آنکھوں میں ہے  
ایرانی قالینوں پر پیسے کی قلابیں صحن گلشن کا لطف دیتی ہیں،  
غور کیجئے دعوت شاہی کے انواع و اقسام کے کمانے کہا کر حمان میوہ کمانے میں مصروف ہیں  
لطف صحبت ہے، زلیخا اس موقع کو تاڑتی تھی کہ ہاں اب موقع ہے کہ ناصحان شفیق کے ضبط کا امتحان  
کرو، اس وقت کہتی ہے کہ اخراج علیحدہ کیا اس سے بہتر موقع اسکے لئے ہو سکتا تھا، ہر مختلف الطباع  
والاحساس عورتوں پر ایک ہی اثر ہونا، اسکا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تو معمولی اثر تھا جو سب پر ہوا،  
اسکے بعد کے مراتب اثر کے جو کچھ ہوئے ہوں انکو خدا بہتر جانتا ہے، یہ کسی مفسر نے نہیں لکھا ہے کہ اسکے سوا  
کسی پرادر کچھ اثر نہیں ہوا، غالباً ہمارے اس بیان سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مفسرین نے جو پیرایہ بیان  
اختیار کیا ہے نہ وہ غیر مخصوص "اور نہ سراسر خلاف عقل" ہے،

اب رہا دوسرے حصہ کا امتحان کرنا چاہیئے۔

سب سے اول اس تغیر کے قائل سے انہیں کے مقرر کردہ اصول کے مطابق روایت کا  
سوال ہوگا، جب قدام کا قول روایت کا محتاج ہے تو تاخرین اس سے کب بے نیاز ہو سکتے ہیں،  
مضمون میں کسی روایت کا حوالہ نہیں لہذا ہم اصول روایت سے قطع نظر کر کے صرف اصول روایت کو  
لیتے ہیں،

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر قیاسات کا اس قدر سلسلہ معانی قرآن میں قائم کرنا ہر شخص کا  
اختیاری ہو جائے جمہور اس مضمون میں ہے، پھر تو قرآن کی کسی روایت کے معنی بجا لانا قائم نہیں ہو سکتا،  
آغاز تفسیر میں صاحب مضمون نے چار سطر سے زیادہ قیاسی تہید قائم کر کے آغاز مطلب کیا ہے  
اس سے قطع نظر کر کے ہم نفس مطلب کو جانچتے ہیں، خلاصہ واقعہ یہ ہے کہ زنان مصر نے یہ کہا کہ چند  
باتوں میں یوسف سے جو ان غلام کہید ہا کر سکتے ہیں اسکو سن کر زلیخا نے انکو بلایا مشورہ کیا، بعد مشورہ

ہر ایک کو بستر اور چھری دی اور حضرت یوسف کو انکے پاس بھیجا وہ انکے پاس آئے تو عورتوں نے ان پر اپنے  
سارے فن و فریب ناز و کرشمے صرف کر دیئے، مگر حضرت یوسف کے قدم ثبات کو لغزش نہ ہوئی، پھر ڈرایا  
اس سے بھی کام نہ چلا تو چھری سے ہاتھ کاٹ لئے، کہ ہم تیر حملہ آوری کے الزام لگا کر تیر کو سزا دیں گے، یہ  
افسوس بھی کارگر نہ ہوا، اس واقعہ کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر عورت کے لئے علیحدہ علیحدہ خلوت  
گاہیں، بستر اور چھری جیسا کی گئی تھی، یا ایک ہی مجلس میں، شکل اول میں اخراج علیحدہ کس طرح صحیح ہوگا،  
معاورہ تو چاہتا ہے مجمع کے سامنے نمایان اور ظاہر ہونے کو، تخلیہ میں باری باری سے ہر عورت کے  
پاس جائیکو نہیں چاہتا، اسکے علاوہ ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ جب اس طرح زلیخا اس ایک کے پاس اپنے  
محبوب کو بھیج رہی تھی تو اسکی غیرت نسوانی کو یہ وسوسہ اور وہم تو نہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے  
کوئی وصل محبوب سے کامیاب ہو جائے؟ اگر نہ تھا تو فطرت انسانی سے وہ دروغی کہ جس شخص کے  
وصل کی تمنا میں اس نے اپنے کو مٹایا، اسی کو آنکھوں کے سامنے خوشی سے دوسری عورتوں کے پاس  
اس غرض سے بھیج دے کہ انکو بہلا پسلا کر اپنی مدعا میں کامیابی حاصل کریں یکے بعد دیگرے یہ منظر پیش نظر ہو  
اور وہ اطمینان سے اسکو دیکھتی رہے، مقام حیرت ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ صاحب مضمون اسکے قائل  
ہیں کہ ناز و کرشمہ کو وہ اپنے مدعا کے حصول کے لئے کام میں لارہی ہیں، زلیخا کے لئے وہ کوشش نہ تھی،  
اور اگر مجمع عام میں یہ ہوا تو پھر ایسا سمان چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا، ایک لڑکا عورتوں کی  
ایک جم غفیر میں چھوڑ دیا جائے، جہن سے ہر ایک کے ہاتھ میں چھری ہو، ہر ایک اسکو ناز و کرشموں سے  
مسخر کر رہی ہو اور حصول مدعا کی فکر میں ہو، اس لڑکے کا اس طوفان ناز میں کیا حال ہوگا اور کس طرح  
وہ ان امور پر مائل ہوگا جو تخلیہ طلب ہوں، واضح ہو کہ وہ لڑکا کوئی بازاری ادبائش نہ تھا، اس کو پچھ  
نا واقف، تخلیہ میں بھی ثابت قدم رہنے والا جوان مرد تھا، کیا وہ اس طوفان بے تمیزی میں اپنی متاع  
عصمت برباد کرنے پر مائل ہو سکتا تھا،



آگے واقعہ یہ ہے کہ نوبت عدالت تک پہنچی اور وہ زخم جو عورتوں نے خود ہاتھوں پر لگائے تھے جرم قرار پا کر حضرت یوسف کی سزاے قید کی باعث ہوئی،

جرم قرار پا کر حضرت یونسؑ کی حالت جانچنی چاہیئے، معاینہ ڈاکٹری نے بتایا ہوگا کہ یہ زخم ایک ہاتھ میں چھری  
لیکر دوسرے ہاتھ میں لگائے گئے ہیں، بالفرض اگر عورتوں نے زخمی ہاتھ میں چھری لیکر دوسرے ہاتھ بھی  
زخمی کر لئے ہونگے، تو یہ زخم پہلے زخموں سے کم ہونگے، اسلئے کہ صحیح اور زخمی ہاتھ کی قوت میں فرق لازم ہے  
پھر یہ جج پیدا ہوئی ہوگی کہ ایک نوجوان ایک عورت کی عفت پر حملہ کرتا ہے، کامیاب ہونے پر چھری سے  
حملہ کرتا ہے یہ واقعہ متعدد عورتوں سے پیش آتا ہے، ایک ہی وقت میں مگر ہر مرتبہ اسکا وار ہاتھ ہی پر  
پڑتا ہے، نہ چہرہ پر زخم آتے ہیں، نہ بازو پر نہ اور کسی مقام پر، اور پھر زخم کی صورت بھی ایسی ہے کہ جیسے  
خود کسی نے چھری سے زخم لگائے ہوں، قیسری جج یہ ہے کہ ایک مجح نسوانی میں ایک نوجوان لڑکا  
یکے بعد دیگرے ہر عورت اسکا شکار بنتی ہے لیکن یہ بہنیں ہوتا کہ سب مل کر اس سے چھٹ جائیں اور  
اسکو مغلوب کر کے اپنی عصمت کو محفوظ رکھیں، کیا کسی پاکدامن عورت کو بیچہ و کرنے کے لئے اس سے  
زیادہ کسی اور کی ضرورت ہے، معلوم بہنیں ان جرجون کا عدالت مجوزہ کو جواب ملا ہوگا، یہ تو قیاس  
بہنیں کیا جاسکتا تھا کہ بغیر ان اہم جرجون کے صفائی کے قید کا حکم سنا دیا ہو،

(باقی)

عہد اسلام میں ہندوستان کی

## جہانزمرانی اور بحری کارنامے

(1)

از جناب محمد یوسف صاحب صدیقی ایم بی، ادا، آراہیں

مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں خلیفہ عمرؓ کے وقت سے شروع ہو گئی تھی، وہ دریائی راستہ سے سندھ آتے اور یہاں کی پیداوار لیکر چھپے جاتے، یہ سلسلہ چند خلفاء کے زمانہ خلافت تک قائم رہا، خلیفہ ولید کے زمانہ میں جب مسلمان دریائی راستہ سے سندھ آ رہے تھے تو دریائے انڈس کے رہنے والے لوٹروں نے دیول کے مقام پر جو سندھ کا ساحل تھا ان کے آٹھ جہازوں کو لوٹ لیا جنکو لنکا کے حاکم نے حجاج اور خلیفہ کو خوش کرنے کے لئے تحفہ بھیجا تھا اور چین قیمتی جواہرات اور قیم اور ساکین تھے، ان لوٹروں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا، اور تمام ملک کو دہلائے ہوئے تھے، ان ہی غارتگروں کی وجہ سے سلطنت ایران جو آزاد اور برسرِ اقتدار تھی خوف زدہ رہتی تھی، ان سے ملک کی خوب حفاظت کی جاتی تھی اور جہاز رانی دریائے ٹانگہ میں تک ناقابلِ گذر خیال کی جاتی تھی، جہازوں کے لوٹ لے جانے پر مسلمانوں نے راجہ داہروالی سندھ کو ان غارتگروں کو کافی سزا دینے کے لئے کہا، راجہ نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ دیول کے لوگ ان کے رعایا نہیں تھے، اس عذر کو مسلمانوں نے عذر لنگ سمجھا، محمد بن قاسم جہاز پر سوار ہو کر دیول آیا، اسکے ساتھ کافی آدمی تھے، اور اسلحہ اور جنگی مشینیں بھی بہتیں ان مشینوں میں ایک کا نام منجیق تھا وہ اس قدر بڑا تھا کہ اسکے استعمال کے لئے ۵۰ آدمیوں کی ضرورت



ہوتی تھی، محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی۔

مسلمانوں کی آمد تجارتی اغراض سے قائم ہو چکی تھی، لیکن محمود غزنوی پہلا شخص تھا جس نے اپنا قدم پورے طور پر جمالیہ اور فتوحات کے، محمود کے سترہ ملے ہندوستان پر ہوئے جب محمود دہلی سے واپس آ رہا تھا تو جاٹوں نے اس کی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، جس سے محمود کو سخت رنج پہنچا اور اس نے جاٹوں پر چڑھائی کی، یہ چڑھائی نہایت شاندار اور دریائی تھی، سراج الیٹ نے اس طور پر اسکا ذکر کیا ہے،

”محمود اپنی فوج بیکرمتان پہنچا اور ۴۰۰ کشتیوں کی طیاری کا حکم دیا، ہر کشتی میں تین سلاخیں

ہوئے کی اس ترکیب سے لگائی گئی تھیں کہ جو چیز کشتیوں کے آس پاس آئے ٹکر کھا کر تباہ و

برباد ہو جائے، ہر کشتی میں تیر انداز تھے اور ہر ایک کے پاس بیشمار تیر و کمان اس سانہ و سامان

کے ساتھ محمود جاٹوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا، جب یہ خبر جاٹوں نے سنی تو وہ مقابلہ کیلئے

طیار ہو گئے، جاٹوں کی کشتیاں ایک قول کے مطابق چار ہزار اور دوسرے قول کے مطابق

آٹھ ہزار تھیں اور پورے طور پر مسلح تھیں، دونوں طرف سے خوب گھمسان لڑائی ہوئی جاٹوں

کی کشتیاں جب شاہی کشتیوں کے قریب پہنچیں تو سلاخوں سے ٹکر کھا کر پاش پاش ہو گئیں

اس طرح پر جاٹوں کی کشتیاں کثیر تعداد میں تباہ و برباد ہوئیں اور انکے آدمی دریا میں غرق ہو گئے۔“

گیارہویں صدی میں البوریخان پیر دلی ہندوستان میں آیا، اور ہندوستان کے کل حالتوں پر گہری نظر ڈالی جس کا نتیجہ اس کی کتاب موسومہ کتاب الہند ہے (اس کتاب کا ترجمہ پروفیسر ساخونے انگریزی میں کیا ہے اور دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، وہ لکھتا ہے کہ مغربی گھاٹ پر یوایچ نامی

۱۵ ابلاوری انتاج سراج الیٹ جلد اول صفحہ ۲۰ و انتاج ہندو لفظ القسطن، ۱۶ تا ۱۷ ہند اوسر

۱۷ سراج الیٹ جلد دوم صفحہ ۴۸۔

ایک قوم آباد تھی جو جہازوں کو لوٹ لیتی تھی، اسکا یہ بھی بیان ہے کہ ساحل گجرات تجارتی ہل چل کا ایک دلچسپ منظر تھا، اور اس ساحل سے شکر و دیگر پیداوار جہازوں میں لا کر غیر مالک کو جاتے تھے اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ مالابار ہند کی کئی تھی، جہاں سے مونگے، موتی، اور گرم مصالح، عراق، خراسان، شام، روم اور یورپ بھیجے جاتے تھے، علاوہ اسکے چین سے بھی اعلیٰ پیمانہ پر تجارت کا سلسلہ تھا، اور بڑے بڑے جہاز جنکو چینی زبان میں جنک کہتے تھے، ہندوستان میں آتے اور یہاں کی پیداوار لیکر چین واپس چلے جاتے تھے۔

بارہویں صدی کا مشہور مورخ الادریسی بھی ہندوستان کی تجارت کو تفصیل سے لکھتا ہے اسکا یہ بھی بیان ہے کہ اس زمانہ میں چین اور ہندوستان سے تجارتی تعلقات تھے، یہی مورخ کا رمنڈل کی روٹی اور مالابار کی الاچی اور کالی مریج کا ذکر کرتا ہے،

تیرہویں صدی میں جب غیاث الدین بلبن سلطنت دہلی کا تاجدار تھا تو طغرل خان گورنر بنگال نے

اپنی خود مختاری کا اعلان کیا، بادشاہ نے طغرل خان کے خلاف دو جہیں روانہ کئے، مگر دونوں جہیں ناکام

ثابت ہوئے، اس ناکامی سے بادشاہ کو بڑی یالوسی ہوئی اور اس نے خود طغرل خان کے سزا دیے کا

ارادہ کیا، اس نے گنگا اور جمنائین کثیر تعداد میں کشتیوں کے ہبیا کرنے کا حکم دیا، شاہی حکم کے مطابق

کشتیاں جمع کی گئیں، بادشاہ بہت بڑے سامان کے ساتھ دو لاکھ فوج لیکر روانہ ہوا، اس وقت

پانی بہت برٹھ گیا تھا، اور گنگا میں ایک تلاطم برپا تھا، سلطان اور اسکی فوج بڑی دقتوں سے گنگا پار

ترے طغرل خان کو جب بادشاہ کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ لکھناؤلی سے جج نگر (جدید پٹنہ) کی طرف

ہٹا گیا سلطان نے پوری قوت کے ساتھ اسکا تعاقب کیا اور چند دنوں میں سونا رگاؤں پہنچا،

جب سلطان سونا رگاؤں پہنچا تو وہاں کا راسے دنوں کے راسے نامی سلطان سے ملا اور اقرار کیا کہ وہ

۱۸ کتاب الہند ماخوذ از تاریخ ہند مولفہ سراج الیٹ جلد اول صفحہ ۶۵، ۶۶، ۶۹،



طغرل خان کے بحری راستہ سے بہاگ جانے سے نگہبانی کر گیا، طغرل خان کے مرجانے پر اور اسکے لشکر کے مکمل شکست کے بعد اس ہم کا غامہ ہو گیا۔

اسی صدی کے آخر میں مالک غیر کے دو سیاح ہندوستان میں آئے، ان میں ایک ابوالفتح دمشقی تھا اور دوسرا مارکوپولو یعنی، اول الذکر مالابار کی کالی مریج اور کارمندل کی رولی کی تجارت کا ذکر کرتا ہے اور اس وقت کے بحری تجارت کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے، وہ ہندوستان کو وسیع نظر سے دیکھتا ہے، اور یہاں کی تجارت کو تفصیل سے لکھتا ہے، وہ ہندوستان اور چین کے تجارتی تعلقات کو بھی ظاہر کرتا ہے، مارکوپولو ہندوستانی جہاز کا تذکرہ تفصیل سے کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ جہاز صوبہ کی لکڑی سے بنے ہوتے تھے اور وہ اس طرح پر کہ دو تھے بیرونی اور اندرونی جانب سے لوسے کی کیلون سے ملائے رہتے تھے، جہاز کے پچھلے حصہ میں ایک قسم کا لیپ لگا دیا جاتا تھا تاکہ پانی کا اثر نہ لپس چونا، سن اور بناتی تیل سے بنایا جاتا تھا۔

یہی سیاح ہندوستانی جہاز کی شکل، پیمانہ، درستی اور طریقہ حرمت پر بھی تفصیل سے لکھتا ہے اسکا بیان ہے کہ جہاز اتنے بڑے ہوتے تھے جنہیں ۵۰ سے ۳۰۰ مسافر سوار ہو سکتے تھے، ان جہازوں پر پانچ چہ ہزار ٹوکریں کالی مریج کے لاوے جاتے تھے، ان جہازوں میں متعدد ڈانڈے ہوتے تھے، اور ہر ڈانڈے پر چار شخص متعین رہتے تھے، جہازوں میں دو یا تین بڑی بڑی کشتیاں لگا جاتی تھیں، جنہر ایک ہزار ٹوکریں کالی مریج کے رہ سکتے تھے، ان جہازوں کو کہینے کے لئے ۶۰-۱۰۰ ملاحوں کی ضرورت ہوتی تھی، کشتیوں کے علاوہ ہر جہاز میں دس ڈیگیان لگائی جاتی تھیں تاکہ چار مارنے اور دیگر ضروریات کے لئے وقت پر کام آسکے، ڈیگیوں میں ساٹھ چوٹی چوٹی کوٹھریاں ہوتی تھیں اور ہر ایک کوٹھری میں ایک سوداگر کے رہنے کے لئے کافی جگہ ہوتی تھی، علاوہ ان کوٹھریوں کے

۱۵، اخوذ از تاج فیروز شاہی مولفہ ہرنی۔

۳۱ کوٹھریاں اور ہوتی تھیں، اور یہ کوٹھریاں موٹے تختے سے بنی ہوتی تھیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوتے تھے، یہ تختے اس غرض سے لگائے رہتے تھے کہ خطرہ کے وقت یا جہاز میں سوراخ ہو جانے پر کام آئے اور مال و اسباب اور مسافر دوسرے ڈویژن میں چلے جائیں تاکہ جان و مال کا نقصان نہ ہو، ڈیگیوں کی وسعت کے لحاظ سے کوٹھریوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی، جب جہاز میں سوراخ ہو جاتا تو اس وقت تختے لگائے جاتے، اگر ایک ناکافی ہوتا تو دو لگائے جاتے تھے، اور اگر دو ناکافی ہوتے تو تین، غرض کہ اسی طرح پر چہ تھے تنہا لگائے جاتے، چہ تختے لگانے کے بعد بھی کام کے قابل نہ رہتا تو ناقابل استعمال تصور ہوتا۔

مارکوپولو مالابار کے موتی کے شکار کا حال تفصیل سے لکھتا ہے، اسکا بیان ہے کہ ایسے جہاز کے مالک عموماً تجارت ہوتے تھے جو اپنی اپنی کمپنی قائم کئے ہوئے تھے، اور متعدد کشتیاں اور جہاز متفرق پیمانہ کے رکھتے تھے، ان جہازوں میں سے اس خوبی سے لگے رہتے تھے کہ جہاز نہایت آسانی سے ٹہر سکتا تھا، ہر ایک کمپنی کی طرف سے متعدد غواص ملازم تھے جو غوطہ مار کر دریا سے پیپی نکالتے تھے، ان غواص کے جسم میں جالی کا ایک تہیلا لگا رہتا تھا تاکہ پیپی کے ملنے پر اس تہیلا میں رکھ سکین، وہ غواص پانی کے اندر اس وقت تک رہتے تھے جب تک وہ سانس روک سکتے تھے، جب سانس ٹوٹنے کے قریب ہوتی تو وہ پانی کے اوپر چلے آتے اور کچھ دیر دم لینے کے بعد پھر غوطہ لگاتے تھے،

سلطان فیروز تغلق نے ۱۳۳۵ء اور ۱۳۳۶ء میں لکھنؤ کی کے خلاف دو مہمیں روانہ کئے، ان دونوں مہموں میں متعدد کشتی ہائے بند کشتان روانہ کئے گئے تھے، جنہیں ایک لاکھ فوج تھی، اور وہ سنار گاؤں کے چاروں طرف دریا پار اترنے کے لئے روانہ ہوئے تھے، ۱۳۳۶ء میں سلطان نے ایک مہم ٹھٹھہ پر بھیجی، اس مہم میں فوج کے دریا سے اندس پار اترنے کے لئے پانچ ہزار کشتیاں جہا کیلگی تھیں۔

۱۵، اخوذ از تاج فیروز شاہی مولفہ ہرنی۔



میں اس وقت یہ دستور تھا کہ اگر کوئی کشتی طوفان کی وجہ سے آجاتی تو اسکو باد آور سمجھ کر لوٹ لیتے تھے لیکن یہاں ایسی کشتیوں کی حفاظت ہوتی تھی اور کسی قسم کی خیانت و ماحول نہیں کیجاتی تھی جب اسکا وارث پیدا ہوتا تو اسکو ویدیا جاتا اور مال سکنے پر دستور کے موافق چالیسواں حصہ لیا جاتا۔

اسی صدی کے ابتدائیں ایک اور روسی سیاح نکولو کونٹی (Nicolo-conte) ہندوستان میں آیا وہ ہندوستانی جہاز اور تجارت کی نسبت اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہندوستان کے باشندے ہمارے جہازوں سے بڑے اور اچھے جہاز بناتے ہیں، انکے جہازوں میں پانچ پال اور پانچ سنول اور دو ہزار بندو رکھنے کی جگہ ہوتی ہے، پچاس حصہ تین تھتے سے بنا ہوتا ہے تاکہ طوفان کو برداشت کر سکے، ان جہازوں میں منڈو خانے اس طرح پر ہوتے ہیں کہ اگر کوئی خانہ پھٹ جائے تو دوسرے خانہ میں مال و اسباب رکھ دے جائیں اور سفر میں کسی طرح کی زحمت نہیں ہوتی، گنگا کے کنارے اونچے اونچے بانس دیکھ کر تعجب کرتا اور کہتا ہے، گنگا کے کنارے بڑے بڑے بانس ہوتے ہیں، جن سے ہلکی، چوٹی پھلی مارنے والی کشتیاں بنائی جاتی ہیں، ہندوستانی تجارت کی نسبت اس طرح بیان کرتا ہے کہ یہاں کے تجارتی بڑے امیر کبیر ہیں اور ان میں اکثر کے پاس چالیس چالیس خاص جہازات ہیں جن سے تجارت کرتے ہیں اور جنکی قیمت ۱۵۰۰۰ سونے کا سکھ ہوتی ہے۔

پندرہویں صدی کے آخر حصہ میں ایک جینیوا کا سوداگر ہیرونیمس ڈی سینٹو اسٹیفینو (Hieronimo di santo stepano) نامی تجارت کی غرض سے ہندوستان میں ایک جہاز پر سوار ہو کر آیا وہ لکھتا ہے کہ میں جس جہاز پر سوار تھا اس جہاز کے شہتیر سو سے سٹے ہوئے تھے اور پال ردی کے بنے ہوئے تھے، جب وہ سارا سے کبے جا رہا تھا تو جزائر مالدیپ کے آگے اسکا جہاز طوفان میں گر گیا لیکن دوسرے جہازوں نے اپنی کشتی پر اسے لے لیا، وہ لکھتا ہے کہ

پندرہویں صدی میں ہندوستان کی حالت مرتبہ ملکوت سوسائٹی،

۱۳۹۸ء میں سلطان تیمور نے ایک ہمہ بین دریا سے اندس پار اترنے کے لئے بہت ہی کم عرصہ میں کشتیوں کا پل باندھ دیا، جس سے اسکی فوج نہایت آسانی سے دریا پار اتری، تیمور کو متعدد لڑائیاں دریا سے لنگ اور جنائین لڑنا پڑیں۔

پندرہویں صدی کے ابتدائیں یعنی ۱۴۰۰ء میں ایک چینی مسلمان حمان نامی سفیر شاہ چین ہندوستان میں آبادہ کالی کٹ کی حالت اس طرح پر بیان کرتا ہے کہ یہ مقام تجارت کی بہت بڑی منڈی ہے اور دنیا کے ہر حصہ سے تجارت کی آمد و رفت رہتی ہے، اسکا یہ بھی بیان ہے کہ جب کوئی جہاز چین سے آتا تو ایک اور سیر مال کی فہرست کر لیتا اور مال کی قیمت لگانے کا ایک دن مقرر کرتا۔ اسی کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندو چین کے درمیان تجارتی تعلقات اعلیٰ پایہ پر تھے، اور دونوں سلطانین کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے، اور اکثر آپس میں ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھیجتے تھے اور ایلچیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

اسی صدی میں عبدالرزاق سفیر مرزا شاہ رخ بادشاہ سمرقند اور ہرات ہندوستان میں آیا وہ بندر کالی کٹ کی نسبت جو اس وقت جہاز رانی کا مرکز سمجھا جاتا تھا اس طرح پر بیان کرتا ہے کہ کالی کٹ آباد و مہمور بندر گاہ ہے، اس بندر گاہ میں بلاد و امصار کے بیشمار تجارتی آتے ہیں اور یہاں سے اکثر جہاز کالی مرج سے بھرے ہوئے مکہ کو جاتے ہیں، کالی کٹ کے باشندے دریائی سفر میں تیز و چالاک ہوتے ہیں، راستہ میں کہیں لوٹیرے کالی کٹ کے جہاز کو روٹنے کی جرات نہیں کرتے، یہاں پر غیر ایرانی اس شہر میں امن و اطمینان اس درجہ تھا کہ تجارت اپنے مال و اسباب جہازوں سے اتارنے اور باروں میں ڈال دیتے تھے، محکمہ جنگی کے سپاہ دن اور رات انکے مال کی حفاظت کرتے تھے، جب مالک کل مال بیچ لیتا تو اس سے چالیسواں حصہ لیتے تھے اور کوئی دوسرا ٹکس ان سے نہیں لیا جاتا تھا، دیگر بنادر



تین جہاز جو ہماری جماعت سے جدا ہو گئے تھے اور ہم سے پانچ میل آگے بڑھ گئے تھے ہماری تباہی کو معلوم کر کے فوراً اپنی کشتیاں بھیجیں اور ہم ایک جہاز پر سوار ہو کر کبے پہنچے۔

پندرہویں صدی اور اوائل سولہویں صدی کے واقعات سے ہندوستان کے بحری کارنامے کی تصدیق ہوتی ہے، اس وقت سلاطین احمد آباد کا مرتبہ مغربی ساحل پر حاکم سمندر کا تھا، اس وقت جاوہا شاہی فہرست میں غیر ملکی بندرگاہ تھا، اور خراج ادا کرتا تھا، یہ خراج اس حفاظت کے لئے ادا کرنا ہوتا تھا جسکی حفاظت شاہی محافظ سے ہوتی تھی،

۱۶۲۹ء میں گجرات کا بادشاہ احمد شاہ ایک بیڑہ جہین، ۱۷ جہاز تھے، بمبئی اور سیلٹ کے چل کرنے کے لئے روانہ کیا جہیں سلاطین بھیجی نے قبضہ کر لیا تھا، گجرات کے ایک اور بیڑے بادشاہ نے ایک بیڑہ لوئیرن کے خلاف روانہ کیا جو ساحل پر لوٹ مار کرتے تھے۔

شاہان گجرات کے بحری کارنامے اگر صراحت سے دیکھنا چاہیں تو تاریخ پورٹگیز کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، ۱۶۲۹ء میں گجرات کا بیڑہ مصریوں کے ساتھ اس غرض سے مل گیا کہ پورٹگیز کو ساحل چول سے ہرگا دیا جائے، اور بالآخر شاہ گجرات نے پورٹگیز کو چول سے ہرگانے میں کامیابی حاصل کی، اس وقت چول بہت بڑی تجارتی منڈی ہو گئی، ایران اور بحیرہ احمر سے تجارتی سلسلہ قائم ہو گیا تھا اسی راستہ سے ہندوستان کے کل جہاز جو یورپ جاتے تھے گزرتے تھے، دوسری مشہور جگہ بھی تھی جہاں نہایت عمدہ شہتیر افراط کے ساتھ پائی جاتی تھی، اس مقام سے شہر میں مکہ جاتی بہتین جنکو ترک اپنے بیڑے کی طیاری میں استعمال کرتے تھے۔

سولہویں صدی میں کالی کٹ بھی ترقی پا کر جہاز سازی کا مرکز ہو گیا، ویتھما (Kerthema) نامی سیاح کی تحریرات سے اس صدی کے جہاز، انکے پیمانہ، شکل، وزن اور بار برداری کا پتہ چلتا ہے۔

۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۷ء ہندوستان میں تاج محل کے متعلق گجرات۔

شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں جہاز رانی و جہاز سازی کو نمایان ترقی ہوئی اور قریب قریب ہر صوبہ میں جہاز سازی کے کارخانے قائم ہوئے، خصوصاً بنگال، کشمیر اور سندھ جہاز رانی اور جہاز سازی کے مرکز تھے۔  
الہ آباد، لاہور اور مشرقی و مغربی سواحل میں بھی جہازات طیار ہوتے تھے، ۱۶۲۹ء میں بنگال میں راجہ ٹوڈر مل نے بحری قیام کے لئے چند پرگنہ مخصوص کر دیئے تھے اور اسکے متعلق ایک دفتر تھا، اس دفتر کے قیام کے لئے ۲۹۲۸۲ روپے مقرر کئے گئے تھے اور پرانے جہازوں کی مرمت کے لئے سالانہ موازنہ میں ۵۲۴۳۸۴ روپے جو مرمت میں صرف ہو جاتے تھے، اس صوبہ میں تین ہزار جہازات اور کشتیاں تھیں جنہیں ۷۸ جنگی جہازات تھے، انکے علاوہ اور بھی کشتیاں تھیں جو جاگیرداروں سے جاگیر کے عوض لی جاتی تھیں، بیڑے کا مستقر ہا کہ تھا اور اسی مقام سے مکہ اور اراکانی سے صوبہ کی حفاظت ہوتی تھی، کیونکہ یہ قومیں اکثر دریائی راستہ سے آنے اور بنگال کو تاخت و تاراج کرتے تھے، اور دہان کے آدمیوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور دکن کے بندرگاہوں میں لیجا کر ڈچ اور فرانسیسی و انگریزوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں میں فروخت کر دیتے تھے، علاوہ متذکرہ بالا رقموں کے دفتر میں بحری سے بھی وہ رقمیں جو بطور ٹکس کے وصول ہوتی تھیں آتی تھیں، ایسی کشتیاں جو مستقر سے ان مسافروں کو لیجا آتی تھیں جو اس ضلع کے باشندے نہ تھے ۸ روپے عہد تک کشتیوں کے اقسام کے لحاظ سے ٹکس لے جاتے تھے، مرشد آباد جانے والی کشتی سے ۸ روپے، کلکتہ جانے والی کشتی سے ۱۰ روپے اور بنارس جانے والی کشتی سے غیر لے جاتے تھے، وہ کشتیاں جو متذکرہ بالا مقاموں سے آتی تھیں فی کشتی ۸ روپے، للہ، بطور ٹکس کے لے جاتے تھے، ابتدا میں محال کا تعلق شہروں کے ساتھ تھا، لیکن اسکے بعد زمینداروں کے متعلق کر دیا گیا، اور یہ ٹکس زمینداروں سے وصول ہونے لگے، زمینداروں کو اس انتظام کے رو سے ایک رجسٹر رکھنا ہوتا تھا جہیں ان کشتیوں کے نام اور پتہ درج ہوتے تھے جو انکی سرحد سے ہو کر گزرتے تھے۔

۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۷ء ہندوستان میں تاج محل کے متعلق گجرات۔



شاہی جہازوں کے بنانے کے لئے سلطنت سے شہتیرین آتی تھیں، سلطنت شہتیر کے قدرتی پیداوار کا ایک مشہور مقام تھا، ان ہی شہتیروں سے ہر قسم کے جہازات اور کشتیاں طیار ہوتی تھیں۔

گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ صوبہ سندھ بھی جہاز رانی اور جہاز سازی کا مرکز بنتا بقول ابوالفضل مصنف آئین اکبری سرکار ٹھٹھا کے پاس چالیس ہزار کشتیاں تھیں، اس وقت لاہوری بندر دریائے انڈس کا مشہور و معروف بندر گاہ تھا، اس بندر گاہ کے مفصل حالات تاجنگ ظاہری سے ظاہر ہوتے ہیں، ہم اس موقع پر صرف اقتباس سے کام لیتے ہیں،

شہر ٹھٹھا اور لاہوری بندر کے درمیان دور و ز کی بحری مسافت ہے، اسکے بعد سمندر میں پہنچنے کے لئے ایک دن اور صرف ہوتا ہے، بندر گاہ سے دریا تک ایک تنگ راستہ تھا جسکو ٹھٹھا کی زبان میں تار کہتے تھے، تنگ راستہ کے وہاں پر میر بندر کی طرف سے ایک محافظ متعین رہتا تھا جب کوئی جہاز اس تنگ راستہ میں داخل ہوتا تھا تو بندوق کی آواز سے اطلاع دیتا تھا جسکا جواب محافظ بھی بندوق ہی کی آواز سے دیتا تھا، پھر وہ ٹھٹھا کے سوداگروں کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دیتے تھے، اور کشتی پر سوار ہو کر وہاں جاتے جہاں محافظ متعین ہوتا تھا، محافظ اسکی اور اسکے جہاز اور مال و اسباب کی پوری حالت پوچھتا، اگر جہاز اسی بندر گاہ کا ہوتا تو لاہوری بندر گاہ میں جانے کی اجازت دیجاتی تھی۔

(باقی)

## مسئلہ زر

از جناب مقبول احمد صاحب رئیس سندیلہ

(۳)

### زر فلزاتی کے استعمال کا طریقہ

دنیا کی سکے سازی میں یا تو سونا استعمال ہوتا ہے یا چاندی اور زر مستند بھی انہیں دہاتوں کا ہونا ہے مبادلہ خارجہ میں ہر دہات اپنی قیمت مبادلہ کے معیار سے قبول کیجاتی ہے جو اکثر کم دیش ہوتی رہتی ہے اسلئے دو فریق پیدا ہو گئے، ایک فلزی، (.....) اور دوسرے فلزینی (.....) کہلائے، ایک فلزی اسکا مدعی ہوا کہ صرف ایک دہات کے استعمال کرنے سے تجارت مبادلہ اور معیار قیمت میں آسانیان ہو جائیگی، دوسرا فلزی اسکا مدعی ہوا کہ دونوں دہاتوں کے استعمال کرنے سے آسانیان پیدا ہوگی، ان دونوں فریقوں میں ایک جنگ عظیم برپا ہو گئی، اب اگرچہ ایک دہات کے استعمال کرنے کا طریقہ صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے مگر یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اسلئے ہم فریقین کے دلائل ناظرین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

زر فلزاتی کے استعمال کرنے کے طریقے مختلف ہیں،

(۱) اگر کسی ملک میں ایک دہات کا سکے زر مستند، معیار قیمت غیر محدود زر قانونی ہوا اور اسکی سکے سازی آزاد ہو تو اس ملک کا طریقہ فلزیت (.....) کہلائے گا، جیسے انگلستان میں صرف سونے کا سکے ہے، اور چین میں صرف چاندی کا سکے ہے،



(۲) اگر کسی ملک میں دونوں دہاتوں کے سکے غیر محدود زر قانونی، از مستند معیار قدر اور گردش کے لئے ضروری ہوں اور دونوں کی سکہ سازی مقرر نرخ مبادلہ کے تناسب سے آزاد ہو، اس ملک کا طریقہ فلزائیت ( . . . . . ) کہلائیکا، اس طریقہ کا رواج ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رہا اور اٹھارہویں صدی کے آخر سے سکہ نگری ریاستہائے متحدہ لاطینی (فرانس، اٹلی، یونان، بلجیم اور سوئٹزرلینڈ) کا رہا،

(۳) اگر کسی ملک میں دونوں دہاتوں کے سکے غیر محدود زر قانونی ہوں اور چلن کے لئے ضروری ہوں مگر صرف ایک کی سکہ سازی آزاد ہو تو ایسا طریقہ فلزائیت ناقص ( . . . . . ) (Demupied Be metalisme) کہلائیکا، یہ طریقہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور فرانس کا ہے،

معیار قدر کے لئے یہ ضروری ہے کہ قیمت زر میں ثبات ہو یعنی اسکی قوت خرید میں حتی الامکان کمی بیشی نہ ہو، اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر دونوں فریق اپنے اپنے دلائل پیش کرتے ہیں حامیان فلزائیت کہتے ہیں کہ

۱- دونوں دہاتوں کے استعمال سے زیادہ ثبات قدر ہوتا ہے اور قیمتوں میں بمقابلہ ایک دہات کے استعمال کے خیف کمی بیشی ہوتی ہے،

(الف) وہ کہتے ہیں کہ دونوں دہاتوں کے زیر مستند ہونکی حالت میں تعداد زر زیادہ ہوگی اور جب تعداد زر زیادہ ہوگی اگر مقدار زر میں اور اضافہ ہوگا تو قیمت زر اور قیمت اشیا پر بمقابلہ ایک دہات کے استعمال کے کم اثر پڑیگا،

(ب) حامیان فلزائیت یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک دہات کی رسد کی کمی بیشی دوسری دہات کی رسد کی کمی بیشی سے برابر ہو جائیگی اور قیمت زر میں ثبات رہیگا اور عام قیمت اشیا یکساں رہیگی،

سکہ نگری کے بعد سے فلزائیت نے یہ صورت ضرور پیدا کر دی تھی، یعنی سونے چاندی کا تناسب قائم رہا، اور نئیں اشیا میں بھی ثبات رہا، لیکن سکہ نگری میں جب قانون سے سونے کی رسد زیادہ ہوئی تو یہ صورت قائم نہ رہی اور یہ اندیشہ ہوا، اور اسکے وجوہات بھی تھے کہ اگر چاندی کے سکہ سازی مخصوص نہ کر دی جائیگی تو چاندی کی رسد میں بھی اضافہ ہوگا، اور فلزائیت بجائے قیمت اشیا میں ثبات کرنے کے سکوس نتیجہ پیدا کرے گی، یہ خیال رکھنا چاہیے کہ حال کی جنگ سے جو ان دہاتوں پر اثر ہوا ہے اسکو بچنے بالکل نظر انداز کیا ہے، اگر موقع ہو تو آئندہ کسی وقت اسکو بصراحت لکھیں گے،

(۲) بحالت فلزائیت نئیں اشیا بڑھانکی وجہ سے پیدا کرنے والوں کو منافع زیادہ ہونگے، اسلئے پیدائش میں ترقی ہوگی یعنی فلزائیت میں چونکہ تعداد زر زیادہ ہوگی اور اس میں بمقابلہ فلزائیت کے اضافہ زیادہ ہوگا، اسلئے بتدریج قیمت زر کم ہوتی جائیگی، اور نئیں اشیا بڑھتی جائیگی، اور جب نئیں اشیا بڑھیں گی تو پیدا کرنے والوں کا منافع بھی بڑھے گا، اور جب نفع زیادہ ہوگا تو پیدائش کی طرف لوگ زیادہ مائل ہونگے اسلئے پیدائش میں ترقی ہوگی،

(۳) فلزائیت میں نئیں اشیا بڑھانے سے اور قیمت زر کم ہو جانے سے قرضدار کو نفع پہنچتا ہے۔ یعنی جب قیمت اشیا بڑھانکی تو کم پیداوار فروخت کرنے سے قرضدار اپنا قرض ادا کر دیگا اور اس ذریعہ سے اسکا بار بھکا ہو جائیگا، اور بحالت فلزائیت قیمت زر بڑھانکی، اور قرضدار کو زیادہ پیداوار اپنے قرض کے ادا کرنے کے لئے فروخت کرنا پڑے گی اور اس طرح اسکے بار میں اضافہ ہو جائیگا،

(۴) بحالت فلزائیت بنک کو آسانی ہو جائیگی کہ وہ کفایت شعاری کے ساتھ اپنا سرمایہ محفوظ جس دہات میں مناسب سمجھے رکھے، اور رد پیہ کا نرخ یعنی سود کم ہو جائیگا اور یکساں رہیگا،

(۵) فلزائیت مساوات مبادلہ سونا استعمال کر نیوالے اور چاندی استعمال کر نیوالے ممالک میں قائم کر کے تجارت خارجہ کی معین ہوتی ہے (مساوات مبادلہ اسوقت ہوتی ہے جب ایک ملک کا تاجر



متحدہ امریکہ میں ۱۹۲۳ء میں صرف چاندی رہ گئی اور سونا غائب ہو گیا، ۱۹۳۳ء میں سونا رہ گیا اور چاندی غائب ہو گئی۔

(۲) اگر اس تناسب قانونی میں جو دو قانون میں قائم کیا گیا ہے بازار کے تناسب سے فرق ہوگا تو قرضخواہ اس دہات میں ادائیگی چاہیں گے جسکی قیمت بڑھ گئی اور قرضدار اس دہات میں ادائیگی چاہیں گے جسکی قیمت گھٹ گئی ہے، یہ صورت کاروبار میں بہتری پیدا کریگی، فرض کیجئے کہ سونے اور چاندی کا تناسب ۱-۱۵ اور ۱۵-۱ کا مقرر ہے، لیکن چاندی کی قیمت بازار کا تناسب سونے کے مقابلہ میں ۱-۱۵ اور ۱۵-۱ کا ہو جائے تو قرضخواہ چاندی کا سکہ چاہیں گے، اور قرضدار سونے کا سکہ دینے پر آمادہ ہوں گے۔

(۳) انگلستان کے مشہور ماہر اقتصادیات مارشل کا یہ اعتراض ہے کہ اگر سونے کا استعمال صنعت و حرفت میں زیادہ ہوگا تو قدر زر بڑھ جائیگی اور سونے چاندی کی مقرر کردہ تناسب بصورت زر اور ذخیرہ بازار کے تناسب میں فرق ہوگا، اس فرق کی وجہ سے (Speculation) (جو) مع تمام خراب نتائج کے شروع ہو جائیگا،

فلزائیت کے عمل پذیر اور غیر عمل پذیر ہونے کی بحث بہت کافی ہوئی اور متحدہ کافرین اُس کے تصفیہ کے لئے منعقد ہوئے، دو کافرین زیادہ دقیقہ بین جو ۱۹۲۳ء میں پیرس میں اور ۱۹۲۳ء میں برسلس میں ہوئے، اور بعد بحث فیصلہ فلزائیت بین الاقوامی کے خلاف ہوا، ہم اس کافرین کے مباحث کو بخیر طوالت نظر انداز کرتے ہیں،

اول تو کافرین کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا، دوسرے سونے کی پیدائش میں پیشی ہوئی اور حامیان فلزائیت کی خواہش قیمت زر گھٹانے کی بھی پوری ہوتی نظر آئی، اسلئے فلزائیت ہی کا رواج ہوا اور اس طریقہ میں چند خوبیاں بمقابلہ فلزیت کے زیادہ ہیں، تمام ممالک متحدہ میں چونکہ سونے کا سکہ رائج ہے اور ہم ہی معیار قیمت ہے، اسلئے ہم سونے کی فلزیت کا ذکر کرتے ہیں۔

اپنے ملک میں زر فلزائی کی ایک رقم کسی سکے میں جمع کرے اور اسکو ہٹیک اسی مقدار کے زر فلزائی پانے کا حق دوسرے ملک میں حاصل ہو جائے۔

ان ممالک میں جہاں معیار قیمت ایک ہی دہات میں ہے، مساوات مبادلہ ہوتی ہے، لیکن ان ممالک میں جن میں کہ ایک ملک میں چاندی معیار قیمت ہے اور دوسرے میں سونا ہے، مساوات مبادلہ نہیں ہوتی ہے، چاندی اور سونے کی قیمت ایک دوسرے کی تناسب سے مقرر نہیں ہوتی ہے بلکہ رسد و طلب کے لحاظ سے کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔

حامیان فلزائیت کہتے ہیں کہ اگر مختلف اقوام اصول فلزائیت کو تسلیم کر لیں اور معاہدہ بین الاقوامی کے ذریعہ سے سونے اور چاندی کی ثمن کا تناسب قائم کر دیں تو ان میں مساوات مبادلہ قائم ہو جائیگی یعنی سونے کی ثمن چاندی کے مقابلہ میں اور چاندی کی ثمن سونے کے مقابلہ میں کم و بیش ہوگی، اور سود اگر دن کو اس وجہ سے کوئی نقصان تجارت خارجہ میں ہوگا اور اس طرح سونا استعمال کرنیوالے اور چاندی استعمال کرنیوالے ممالک میں تجارت کی ترقی ہوگی۔

بیان یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بقول حامیان فلزائیت (بین الاقوامی فلزائیت میں یہ سب فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اگر کسی خاص ملک میں یہ طریقہ رائج ہوگا تو زیادہ کامیابی ہوگی۔

### مخالفین کے اعتراضات

مخالفین فلزائیت یہ اعتراض کرتے ہیں کہ

(۱) ان ممالک میں جو فلزائیت کو تسلیم کر لیں گے، ان میں صرف ایک قسم کا روپیہ یعنی زر ناقص ہی ہوگا، ہم قانون کرشمہ کی تشریح میں یہ بتلا چکے ہیں کہ اگر کسی ملک میں زر کامل اور ناقص دونوں چلتے ہوئے تو زر ناقص چلن میں رہ جائیگا اور کامل غائب ہو جائیگا، فلزائیت میں صرف وہ روپیہ جسکی چلن میں قدر بصورت سکے بمقابلہ دہات کے زیادہ ہے رہ جائیگا، اور زر کامل غائب ہو جائیگا، ریاستہائے



(۱) فلزیت بمقابلہ فلز انیت زیادہ صاف اور واضح طریقہ ہے اور کاروبار میں زیادہ آسانی پیدا کرتا ہے،

(۲) چونکہ سونا بمقابلہ چاندی کے زیادہ قیمتی ہے، اسلئے وہ ترقی یافتہ ممالک کے لئے جبکہ کاروبار بڑے ہیں اور آمدنیوں زیادہ ہیں روپیہ کے کام دینے کے لئے زیادہ موزوں ہے،

(۳) پروفیسر کیلے کی رائے میں قیمت زرمین کی بیشی فلزیت اس قدر زیادہ مشکلات انجام کا نہیں پیدا کرتی ہے جیسا کہ فلز انیت۔

(۴) بوجہ ترقی فن کان کنی بحالت فلز انیت سونے کی رسد کا وزن سے اسکی طلب کے برابر ہوگی اور ضروریات زر کے لئے سونا کافی ملتا رہیگا۔

ہم نے فلزیت و فلز انیت دونوں کے موافق و مخالف دلائل لکھ دیئے، فلزیت میں چونکہ آسانیاں زیادہ ہیں اسلئے یہی طریقہ تسلیم کیا گیا، سونا استعمال کرنا سونے اور چاندی استعمال کرنا سونے کے مبادلہ خارجہ میں دونوں دہاتوں کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی تھی اسلئے ایک نیا طریقہ اور ایجاد کیا گیا جسکو معیار مبادلہ طلا (gold exchange standard) کہتے ہیں اسکا سب سے

پہلا رواج جاوا میں ہوا، اب ہندوستان، فلپائن، میکسیکو اور نیپال میں یہی طریقہ رائج ہے، جس ملک میں (۱) دونوں دہاتوں کے سکے غیر محدود زر قانونی ہوں (۲) اندرون ملک کی چلن کے لئے چاندی کا سکے ہو اور سونے کا سکے جو بین الاقوامی سکے کہا جاتا ہے، چاندی کے سکے کے معاوضہ میں اندرون ملک کی چلن کے لئے عام طور پر بہ آسانی نہ ملتا ہو (۳) مبادلہ خارجہ کے لئے چاندی کے سکے کے معاوضہ میں سونے کا سکے ایک مقررہ تناسب کے حساب سے بہ آسانی ملتا ہو اور سونے کا ایک رقم محفوظ اسی ضرورت کے پورا کرنے کے واسطے موجود ہو تو وہ طریقہ معیار مبادلہ طلا کہلائیگا۔

ہندوستان میں چاندی کا روپیہ عام طور پر چلتا ہے، اور سادرن زیادہ کثرت کے ساتھ

چلن میں نہیں ہیں، چاندی کے سکے کے معاوضہ میں گورنمنٹ سادرن دینے پر مجبور نہیں ہے، لیکن مبادلہ خارجہ کے لئے سادرن ملتے ہیں، اور ایک رقم محفوظ بھی اسی ضرورت سے لندن میں رہتی ہے (سادرن اور روپیہ کا تناسب عموماً ۱- اور ۱۰ اکارتہا تھا، لیکن اب اثرات جنگ کے باعث غیر متعین ہے اور روپیہ کی سکے سازی محدود ہے،

اس طریقہ کے عامی اس بات کے مدعی ہیں کہ آئندہ تمام ممالک میں یہی طریقہ رائج ہو جائیگا یعنی معیار سونے کے سکے کا ہوگا، مگر سونے کا سکے چلن میں نہ ہوگا، سب سے بڑا فائدہ اسکا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ (۱) اندرون ملک کی گردش کے لئے سکے کم قیمت میں بنائے گئے یعنی کم قیمت دہات سے کام چلیگا اگرچہ سستی دہات کے سکے کی قیمت بڑھا دی جائیگی یعنی زر وضعی کر دیا جائیگا،

(۲) اور مبادلہ خارجہ میں ثبات رہیگا، یعنی ایک مقررہ تناسب سے چاندی کے سکے کے معاوضہ میں سونے کے سکے مبادلہ خارجہ کے لئے مل جائیں گے،

کسی شخص کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ ثبات نرخ مبادلہ خارجہ مفید ہے اور طریقہ بالا میں یہ خوبی ضرور ہے لیکن ثبات نرخ سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ روپیہ کی قیمت سونے میں مقرر کر دیجے وہ اور افعال زر بھی اس طریقہ خاص میں انجام دیگا۔

ہم افعال زر میں لکھ چکے ہیں کہ پہلا اور اہم فعل زر کا یہ ہے کہ آلہ مبادلہ ہونے صرف مبادلہ خارجہ کے لئے بلکہ اندرون ملک کے تجارت و صنعت وغیرہ کے لئے بھی، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے روپیہ ایسا ہونا چاہیئے کہ عام طور پر قبول کیا جائے، اور عام طور پر قبول ہونے کے لئے زر میں قیمت ذاتی کا ہونا لازمی ہے، روپیہ کی دہات کی کم قیمت کے باعث خفیف بے اطمینانی بھی اسکے عام طور پر قبول ہونے میں مانع ہوگی۔

آلہ مبادلہ کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ وہ ضروریات تجارت کے ساتھ مطابقت کرے،



تجارت کے حجم کی کمی جیسی کے ساتھ زر کے حجم میں بھی ہو جایا کرے، یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی اگر قیمت زر اسکی دہات کی قدر کے برابر ہو، بحالت زر وضعی یہ ہونا غیر ممکن ہے، اگر دہات کی قیمت روپیہ کی قیمت کے برابر ہوگی تو جو وقت مقدار زر زیادہ ہوگی لوگ روپیہ گلا ڈالیں گے، اگر دہات کی قیمت روپیہ کی قیمت کے برابر نہ ہوگی تو یہ صورت غیر ممکن ہے،

افعال زر میں ہم یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ وہ خزینہ القدر کا کام دے، اس طریقہ میں لوگ صرف وہ روپیہ جمع کرینگے جسکی قیمت فلزاتی اسکی قیمت زر سے کم ہو، زر وضعی ہرگز جمع نہ کرینگے، انکو پیشہ اشتباہ رہیگا کہ آئندہ زر وضعی کی قیمت کیا ہوگی، ہندوستان میں ساورن کی مانگ خزینہ القدر کے لئے ہے یعنی جمع کرنے کے لئے ہے اور روپیہ پر بے اطمینانی بھی ظاہر کرتی ہے،

ہم نے مختصر طور پر اسکی خوبیاں اور چند اعتراضات لکھ دیئے، اسکی مفصل بحث کی گنجائش اس مضمون میں نہیں ہے، چونکہ ہندوستان پر اس طریقہ کے خاص اثرات پڑے ہیں، اسلئے بعد تحقیقات کمیشن جو حال میں چاندی کی قیمت بڑھانکی وجہ سے مقرر ہوا ہے، ہم اس طریقہ کے معائب کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھیں گے۔

### زر کا غذی

ہم نے اقسام زر میں لکھا ہے کہ زر کا غذی وہ ہے جو سلطنت یا کسی بنک کے اعتبار پر کسی ملک میں رائج ہوں اور عام طور پر لوگ اسپر اعتماد رکھتے ہوں اور مبادلہ میں قبول کرتے ہوں، اب زر کا غذی کے اقسام اور اسکے استعمال کے فوائد و نقصانات مختصر طریقہ پر لکھتے ہیں۔

زر کا غذی تین قسم کا ہوتا ہے، نیابتی زر کا غذی، اعتباری یا بدل پذیر زر کا غذی، رسمی یا غیر بدل پذیر زر کا غذی۔

1- Representative paper money, (2) Convertible, Redeemable, or fiduciary paper money, (3) Fiat, Inconvertible, Irredeemable, or conventional paper money.

۱- نیابتی زر کا غذی، اس زر فلزاتی کی رسید ہوتی ہے جو سرکاری خزانہ یا بنک میں جمع کیا جاتا ہے جیسے امریکہ کے پروانہ طلا و نقرہ۔

یہ مثل زر فلزاتی کے ہوتا ہے اور ہر جگہ قبول کیا جاتا ہے کیونکہ اسکے پیش کنندہ کو ہر وقت رقم مندرجہ نیابتی زر کا غذی مل سکتی ہے، اور اجرا کنندہ کو زر فلزاتی کی ٹھیک اسقدر رقم محفوظ رہے وقت موجود رکھنا پڑتی ہے جو نیابتی زر کا غذی میں درج ہوتی ہے،

۲- اعتباری یا بدل پذیر زر کا غذی وہ نوٹ کہلاتے ہیں جو سرکاری بنک کی طرف سے اس وعدہ پر جاری ہوتے ہیں کہ اسکے پیش کنندہ کو بوقت مطالبہ فوراً زر فلزاتی بقدر مندرجہ نوٹ ادا کر دیئے جائیں گے۔

یہ نوٹ چونکہ گورنمنٹ یا بنک کے اعتبار پر چلتے ہیں اسلئے وہ ہر وقت نہیں بھٹتے ہیں بلکہ عام طور پر داد و مستند خرید و فروخت میں چلتے رہتے ہیں، انکی ادائیگی کے واسطے اجرا کنندہ کو زر فلزاتی کی رقم محفوظ اجرا شدہ نوٹ کے مقابلہ میں کم رکھنا پڑتی ہے، جیسے ہندوستان کے نوٹ سچے جاتے ہیں اور انگلستان کے بنک کے نوٹ انکی ادائیگی کے لئے پوری رقم رکھنے کی ضرورت نہیں،

۳- رسمی یا غیر بدل پذیر زر کا غذی، وہ نوٹ کہلاتے ہیں جنکے پیش کرنیوالے کو بوقت مطالبہ زر فلزاتی بقدر مندرجہ نوٹ نہیں مل سکتے ہیں، اور ان نوٹ کو سرکار اپنے حکم سے جاری کرتی ہے انکی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہیں جو شروع سے غیر بدل پذیر ہوتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو ابتدا میں بصورت بدل پذیر جاری کئے جاتے ہیں مگر بعد کو غیر بدل پذیر ہو جاتے ہیں جیسے فرانس کے دور انقلاب کے ایگنیٹ (Assignats) اور انگلستان کے بنک کے نوٹ

از ۱۷۹۳ء تا ۱۸۰۰ء اور امریکہ کے گرین بیک (greenbacks) جو امریکہ نے سول وار کے زمانہ میں جاری کئے تھے۔



### زیر کاغذی کے فوائد

زیر کاغذی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں زرفلز آتی کافی تعداد میں موجود ہوں اور زیر کاغذی چلایا جائے تو جب قدر زرفلز کاغذی زرفلز آتی کے بجائے مستعمل ہوگا اس قدر زرفلز آتی ملک کی صنعت و حرفت میں عرف ہو سیکے گا، یا مالک خارجہ سے اشیاء خریدنے میں کام آئیگا، اگر کل مالک بالاتفاق زیر کاغذی استعمال کرنے لگیں تو جب قدر محنت اور روپیہ قیمتی دھاتوں کے نکالنے میں صرف ہوتا ہے وہ کسی مفید کام میں صرف ہونے لگے۔

زیر کاغذی کے آلہ مبادلہ ہونے سے ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ جب قدر نقصانات زرفلز آتی کے گہنے سے ہوتے ہیں وہ ہونگے، اسکے علاوہ بڑی رقموں کا زیر کاغذی سے ادا کرنا بمقابلہ زرفلز آتی کے زیادہ آسان ہے اور کسی دور دراز مقام میں رقم کثیر کا زیر کاغذی میں لیجانا زیادہ آسان اور کم خرچ ہے یہ سب زیر کاغذی فوائد اقتصادی ہیں۔

اسکا مالی فائدہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو جو کچھ رقم سود میں قرض لینے کی وجہ سے دنیا پڑتی ہے نہ دنیا پڑیگی یعنی بقدر ضرورت، بجائے قرض لینے کے وہ زیر کاغذی جاری کر دے اور سود سے محفوظ ہو جائے، اسکے علاوہ گورنمنٹ کو آمدنی بغیر ٹکس لگائے ہو جاتی ہے، یہ طریقہ اکثر وہ سلطنتیں اختیار کرتی ہیں جنکی سا کہ خراب ہو جاتی ہے اور انکو قرض بڑی شرح سود پر ملتا ہے، اس سلسلہ میں ہم اقتصادیات کے ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا اجراءے زیر کاغذی دولت پیدا کرنے کے مترادف ہے، اسکی بحث اگرچہ نہایت دلچسپ ہے، لیکن اس مضمون میں اسکی گنجائش نہیں محققاً اسکی بابت یہ خیال پہلے تھا کہ جب قدر نوٹ جاری کئے جاتے ہیں اس قدر دولت پیدا ہو جاتی ہے اب اس خیال کی غلطی ظاہر ہو گئی ہے اور یہ خیال صحیح سمجھا جاتا ہے کہ جب قدر زرفلز آتی کے بجائے گردش میں زیر کاغذی استعمال ہوتا ہے اس قدر دولت پیدا ہو جاتی ہے، اگر کسی ملک میں ایک

کرور روپیہ چلن میں ہو، اور نوٹ جاری کرنیکی وجہ سے ۲۰ لاکھ روپیہ چلن سے نکل کر ملکی صنعت و حرفت اور زراعتی کاموں میں یا مالک خارجہ سے اشیاء خریدنے میں صرف ہوا ہے، تو ملک میں بقدر ۲۰ لاکھ کے دولت میں اضافہ ہو گیا۔

### نقصان زیر کاغذی

زیر کاغذی کے استعمال میں چند نقصان بھی ہیں، پہلا تو یہ ہے کہ زیر کاغذی کی قیمت میں ثبات بمقابلہ زرفلز آتی کے کم ہوتا ہے، چونکہ اجراء زیر کاغذی گورنمنٹ کی مرضی یا پالیسی پر موقوف ہوتا ہے اسلئے گورنمنٹ اکثر زیادہ تعداد میں نوٹ جاری کر دیتی ہے جسکی وجہ سے اسکی قدر گھٹ جاتی ہے زرفلز آتی میں چونکہ بوجہ مصارف کا نکتہ وغیرہ رسد میں باسانی زیادہ اضافہ نہیں ہوتا ہے اسلئے اسکی قدر نہیں گھٹتی ہے۔

(۲) زیر کاغذی کی بنیاد بہت ضعیف ہوتی ہے، یعنی سلطنت کے نفاذ قانون کی وجہ سے زیر کاغذی کی قیمت ہوتی ہے، اگر سلطنت مالی مشکلات کی وجہ سے دوسرا قانون نافذ کر کے نوٹ کا رواج بند کر دے تو زیر کاغذی ردی کاغذ سے بھی بدتر ہو جائے، زرفلز آتی کی قیمت چونکہ اسکی دھات کی وجہ سے ہوتی ہے، اسلئے اگر گورنمنٹ قانوناً کسی زرفلز آتی کا رواج بند کر دے تو بھی اسکی قیمت فلز آتی بانی ہوگی، (۳) زیر کاغذی میں چونکہ قدر ذاتی نہیں ہوتی ہے، اسلئے وہ صرف اندرون ملک کی چلن میں استعمال ہو سکتا ہے، مبادلہ خارجہ میں نہیں قبول کیا جائیگا، زرفلز آتی اپنی دھات کی قیمت کے حساب سے ہمیشہ قبول ہوگا،

اگر مختلف ممالک مل کر کوئی خاص قسم کا زیر کاغذی جاری کریں جسکو سب قبول بھی کریں اور اسکا اجراء بھی کسی خاص اصول کا پابند ہو تو شاید یہ معائب کم ہو جائیں جسکی امید کم معلوم ہوتی ہے، (باقی)



## چارلس ڈارون

(از جناب مولوی محمد سعید صاحب انصاری رفیق و لطفین)

یورپ کے بڑے بڑے اہل کمال نے مختلف شعبوں میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں، مارٹن نے اتھر کا اکتشاف کیا ہے، فرنگلن نے چپا پہ ایجاد کیا ہے، سمینس نے ٹیلیفون بنایا ہے، لوئس موبار نے ہوائی جہازوں میں حرکت پیدا کی ہے، اور ان کے پر ایجاد کئے ہیں، نیوٹن نے علم الفلك اور طبیعیات جدیدہ کی بنیاد رکھی ہے، لیکن ڈارون وہ ہے جس نے موجودہ دور علمی کو پیدا کیا ہے اور اس بنا پر اسکو تمدن یورپ میں جو درجہ حاصل ہے کسی کو حاصل نہیں،

ولادت اور سن رشد | ڈارون انگلینڈ کے شہر شروزبری (Shrewsbury) میں

۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو پیدا ہوا، ۸ سال کا تھا کہ جولائی ۱۸۱۷ء میں اسکی مان نے انتقال کیا، اسی سال وہ ایک مدرسہ میں داخل ہوا، جہاں وہ سال بھر تک پڑھتا رہا، وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ تیز نہ تھا، البتہ تاریخ طبعی کا شروع سے دلدادہ تھا، اسی بنا پر کثرت سے مختلف قسم کے نباتات سیپ، آبی جانور اور سکے جمع کیا کرتا تھا، اور یہ بات اسکے بہائی بہنوں میں نہ تھی، چنانچہ ایک مرتبہ اس نے اپنے دوستوں کے مجمع میں دعویٰ کیا تھا کہ میں مختلف رنگ کے نباتات رنگین سوائل سے سینچ کر پیدا کر سکتا ہوں۔ اسی طرح اس نے ایک مرتبہ اپنے باپ کے بہت سے درخت غائب کر دیئے اور پھر اپنے احباب میں دوڑ دوڑ کر یہ خبر شہور کی کہ میں نے ان درختوں کا پتہ لگا لیا۔

اسکو چڑیوں کے اندسے جمع کرنے کا بہت شوق تھا، اور ہر گھونسلے سے ایک اندالکا لیتا تھا

لیکن ایک مرتبہ شرارت سے سب اندسے نکال لئے اور گھونسلہ بالکل خالی کر دیا،

اسکو غسل کا بہت شوق تھا اور چار برس کے سن سے دریا میں نہانے جاتا تھا، اسی وجہ سے اسکو دریائی شکار کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ گھنٹوں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا ماہی گیری کا تماشا دیکھتا تھا، ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ پانی اور رنگ سے کیڑے مر جاتے ہیں، چنانچہ اس تجربہ کیلئے اس نے ہزاروں کیڑے مار ڈالے، ایک مرتبہ ایک کتے کا پٹا نظر پڑا تو اسکو دیر تک مارتا، اور اسکی سخت جانی کا تجربہ کرتا رہا،

۱۸۱۷ء میں وہ ایک کالج میں بھیجا گیا جہاں وہ ۱۸۲۵ء تک پڑھتا رہا، اسوقت اسکا سن ۱۶ برس کا تھا، اور اگرچہ اسکا گریباں کل قریب تھا تاہم وہ بورڈنگ میں رہتا تھا اور گھر آتا جاتا تھا، بیان اس نے دوڑنے کی خوب مشق کی تھی،

اس زمانہ میں اسکو تنہائی بہت محبوب تھی، اور وہ اکثر کسی کسی خیال میں محو رہتا تھا، یہاں تک کہ بسا اوقات اسکو یہ بھی پتہ نہیں لگتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ وہ ایک بلند مقام سے گزر رہا تھا جبکہ آگے تیشب تھا، جب تیشب آیا تو چونکہ اسکو مطلق خبر نہ تھی اسلئے اس میں گہرا۔ اس کالج میں چونکہ ادب زیادہ اور تاریخ و جغرافیہ کم پڑھایا جاتا تھا، اسلئے اس نے عقلی ترقی کے لئے اچھا موقع پایا، لیکن لغت وغیرہ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہا، بیان اشعار بھی کہلائے جاتے تھے، اور یہ اسکے لئے اتنی بڑی مصیبت تھی کہ وہ کسی طرح اسکو برداشت نہیں کر سکتا تھا اسلئے ساتھیوں سے قدام کے اشعار جمع کرانا اور انکو کاٹ چھانٹ کر اپنا کر لیتا تھا، لیکن بعد میں وہ نظم پر قادر ہو گیا اور ہر موضوع پر لکھنے لگا،

بیان اشعار زبانی یاد کر اسے جاتے تھے اور انکو وہ آسانی سے حفظ کر لیتا تھا، چنانچہ وہ ہر مر کے شعر صحیح کو یاد کرتا لیکن ۸۰ گھنٹے کے بعد بھول جاتا تھا، اسکو اگرچہ شعرو سخن سے بالکل دلچسپی نہ تھی



تاہم کرنی (Carnegie) کی نظم کو جو فرانسیسی زبان میں ہو اس کے دافعہ کے متعلق کسی کو بہت پسند کرتا تھا،

وہ پڑھنے لکھنے میں اگرچہ بہت محنت کرتا اور اپنی جماعت میں متوسط درجہ کا طالب علم شمار ہوتا تھا تاہم اسکے باپ اور اساتذہ اسکو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ اسکے باپ نے کہا کہ تم کو خوف شکار کرنا، کتے پالنا اور چوسے جمع کرنا آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ننگ خاندان ہو گے پڑھنے کے زمانہ میں وہ مسائل پر غور کرتا اور جب کوئی مسئلہ حل ہو جاتا تو بہت خوش ہوتا تھا چنانچہ اقلیدس کے براہین ہندی اسکو زبانی یاد تھے اور وہ انکو سمجھ کر بہت مسرور ہوتا تھا، اسی طرح بارومیٹر (قیاس میزان ابھوار) کے مشکل مسائل جب حل کئے تو بہت خوش ہوا،

پڑھنے کے علاوہ اسکو کتب بینی کا بھی بہت شوق تھا، چنانچہ کالج کے لائبریری میں گنٹھوں کھڑے کھڑے شکیر، نامن، بریرین اور اسکاٹ کی کتابیں دیکھا کرتا تھا، لیکن چونکہ اسکو اشعار سے بالکل دلچسپی نہ تھی اسلئے بھول جاتا تھا،

اکتوبر ۱۸۷۵ء میں اسکے باپ نے اس کالج سے نکال کر اسکو ڈمبرگ یونیورسٹی میں داخل کر دیا بیان اس نے دو برس تک طلبہ وغیرہ کی تحصیل کی، لیکن چونکہ اساتذہ کے لکچر بہت معمولی اور سطحی ہوتے تھے اسلئے اسکو بیان کی تعلیم پسند تھی لسی بنا پر وہ نباتات اور تشریح کے استادوں سے خاص طور پر فیض رکھتا تھا، البتہ کمیاء کا لکچر اچھا ہوتا تھا، لیکن وقت یہ تھی کہ وہ سرے سے اس نظام تعلیم ہی کا مخالف تھا اور لکچر کے بجائے کتاب کے مطالعہ کو ترجیح دیتا تھا، اس بنا پر وہ اس کالج سے بالکل کورا نکلا کیونکہ وہ طلبہ کو بالکل بیکار اور اپنی آئندہ مشاغل کے منافی سمجھتا تھا، اگرچہ ابتداء میں اسکو مردوں کی چیریں اور بیماروں کے علاج سے خاص شغف تھا، اور اسکے باپ نے اسکے طبیب حاذق ہونے کی پیشینگوئی بھی کر دی تھی تاہم چونکہ اب اسکا احساس نہایت لطیف ہو گیا تھا، اسلئے اسکو چیر ہپاڑے کے کمرہ میں

جاتے ہوئے گھن معلوم ہوتی تھی، اور چونکہ اس زمانہ تک بیہوشی کی دوا لوگون کو نہیں معلوم تھی اس لئے مردیون کی چیر ہپاڑین سخت وقت پڑتی تھی اور دارون انکی تکلیف کو دیکھ نہین سکتا تھا،

یہ دیکھ کر اسکے باپ نے اہیات پڑھانے کا فیصلہ کیا، لیکن چونکہ کالج چھوڑنے کے بعد سے اس نے ادب کی ایک کتاب بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ ان علوم حتی کہ یونانی زبان کو بھی بالکل بھول گیا تھا اور یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے ان چیزوں کے یاد ہونے کی ضرورت تھی، اسلئے اس نے کچھ عرصہ تک گہرہ کر ایک استاد سے ادب کی کتابیں پڑھیں، اور یونانی زبان سے ترجمہ کرنے کی مشق کی، اور ۱۸۷۶ء میں جب وہ داخلہ کے قابل ہو گیا تو کیمبرج یونیورسٹی میں اپنا نام لکھایا لیکن بیان بھی اسکا تین برس کا قیام بالکل بیکار ثابت ہوا، اسی زمانہ میں اسکو ریاضی کا شوق پیدا ہوا اور اسکے لئے اس نے لبارتھ کا سفر کیا اور ایک مخصوص استاد سے اسکی تحصیل کی لیکن ریاضی کے قواعد اسکے سمجھ میں اچھی طرح نہین آئے اور جبر و مقابلہ کے اصول کو وہ لغو سمجھتا رہا۔

یونیورسٹی کے ادبی لکچرون میں بھی برائے نام شامل ہوا، اخیر سال میں البتہ ڈگری حاصل کرنے کے لئے اس نے زیادہ محنت کی، اور اسکا یہ خیال ایک کتاب دیکھ کر اور قوی ہوا، یہ کتاب عیسائی مذہب کی بعض تعلیمات اور اسکے فلسفہ اخلاق پر تھی، اور چونکہ اسکا پیرایہ بالکل منطقی تھا اس لئے دارون کو اسکے مباحث سے خاص دلچسپی تھی، اس کتاب کے دیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ نہایت صحیح طریقہ سے ہر چیز کی دلیل بیان کر سکتا تھا اور چونکہ اسکو اس نے نہایت غور سے پڑھا تھا اور الفاظ کے مجاسے معانی پر زیادہ توجہ کی تھی، اسلئے خیالات کی ترتیب و تہذیب کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ آئندہ سے پاس ہونے والوں کے علاوہ وہ اپنی جماعت میں کسی سے کم نہین رہا،

بیان مختلف عنوانات پر لکچر دیئے جاتے تھے، اور ان میں طلبہ کی شرکت لازمی تھی لیکن دارون بہت سے لکچرون سے غائب رہتا تھا، ایک پروفیسر جو جیولوجی پر لکچر دیتا تھا بہت بڑا ادیب بھی تھا



اور اسلئے اسکے لکچرون میں سائل کے علاوہ ادب کی بھی چاشنی ہوتی تھی، ڈارون اسکے لکچرون میں بہت کم شریک ہوا، حالانکہ اگر وہ انکو غور سے سنتا تو طبقات الارض کا بہت بڑا عالم ہوتا اسی طرح پروفیسر ہنریک ہاتات پر نہایت مکمل لکچر دیتا تھا، اور طلبہ کو جگون سیدانوں، وادیوں اور نرون کے کنارہ لیجاتا، اور وہ انکو عجیب و غریب شکلوں کے حیوانات اور نباتات کا مشاہدہ کراتا تھا، یہ سفر اگرچہ نہایت پر لطف ہوتے تھے تاہم ڈارون اسکے لکچرون اور ہنریک ہاتات کی طرح بہت سے مواقع حاصل تھے تاہم وہ سیر و شکار اور شکاری میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا، جس سے ایک طرف تو تعلیم کا نقصان ہوا اور دوسری طرف سوسائٹی کے اثر سے اسکا مذاق پست ہو گیا، کیونکہ اسکے احباب عموماً کھیل کود، سیر و تفریح، اکل و شرب، اور تماشہ کیلئے میں اپنا وقت ضائع کیا کرتے تھے،

لیکن اسکے ساتھ ہی اسکے بعض ایسے دوست بھی تھے جنکی وجہ سے اسکو فنون لطیفہ کا ذوق پیدا ہوا، چنانچہ "پوشلی" نے اسکو تصویر کشی کی طرف راغب کیا، جس سے آگے چل کر اسکو عجائب خانوں میں جانے اور تصویر دن کے صن و قج پر بحث کرنے کا شوق پیدا ہوا، اسی طرح ہر برٹ نے اسکو موسیقی کی طرف مائل کیا جس سے اسکو اپنی انفعالی قوت کے اندازہ کر نیکا موقع ملا،

بقیہ زندگی | ان باتوں نے اگرچہ اسکو علمی ترقیوں سے محروم کر دیا تھا تاہم چونکہ وہ اب ہر چیز پر نہایت گہری نظر ڈالنے لگا تھا اسلئے قوت استنباط بہت تیز ہو گئی، اور اسکا دماغ باریک بینی اور نکتہ آفرینی کا عادی ہو گیا، اس بنا پر اس نے اپنے خیالات کے ظاہر کرنے کے لئے تصنیف کا میدان تلاش کیا لیکن وقت یہ تھی کہ ابھی وہ اسپر اچھی طرح قادر نہ تھا، اسلئے جملوں کی ترکیب، الفاظ کی نشست اور کلام کی ترتیب میں اسکا سارا وقت ضائع ہو جاتا تھا، اور بہت سے خیالات دماغ سے نکل جاتے تھے، اس بنا پر اس نے ایک کتاب میں اشارات لکھنے شروع کئے، جنکو اوقات فرصت میں وہ مضمون کی صورت میں مرتب کرتا، اور اسکی عبارت کو درست کرتا تھا،

تصنیف کے لئے دست مطالعہ نہایت ضروری تھے، اور اسکا ڈارون نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ جو کچھ دیکھتا اسکو نہایت ترتیب سے یاد رکھتا، اور ہر بحث کے شروع میں چند ایسے جملے لکھ دیتا جو تمام بحث کا خلاصہ ہوتے تھے، انہیں جملوں سے وہ اپنی تصنیفات میں کام لیتا تھا چنانچہ اسکی کتابوں کو پڑھکر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسروں کی معلومات کو اپنی مباحث کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے، وہ کتابوں کے آخرین مضامین کی ایک فہرست لگاتا تھا، جس سے اسکو حوالوں کے نکالنے میں آسانی ہوتی تھی، اور ہر مسئلہ کے متعلق اپنی رائے لکھتا تھا، جس سے تصنیف کے وقت اسکو مدد ملتی تھی،

عمر کے آخری ۲۰-۳۰ برس میں اسکو اشعار سے بالکل رغبت ہنیں رہ گئی تھی، اور وہ ایک شعر کے پڑھنے پر بھی قادر ہنیں رہا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ شکسپیر کی تصنیفات دیکھنے کا ارادہ کیا تو سستی مانع ہوئی اور اس خیال سے باز آیا، اسی طرح تصویر کشی اور موسیقی سے بھی طبیعت بھر گئی اور مناظر فطرت کے دیکھنے سے جی اکتا گیا، اور اسکے بجائے اسکو ناول اور ڈرامے کا شوق پیدا ہوا لیکن ان میں وہ صرف ان کتابوں کو پسند کرتا تھا جنکا لب و لہجہ معتدل ہو، اور مبالغہ سے خالی ہوں جن افسانوں کی ٹریجڈی افسوسناک واقعات پر ختم ہوتی تھی انکو وہ سخت ناپسند کرتا تھا، اسی طرح اسکو اور فنون جمیلہ سے بھی دلچسپی ہنیں رہی تھی، کیونکہ اب اسکی عقل صرف ایک ایسا آلہ رہ گئی تھی جسکے ذریعہ وہ اپنے تخیلات کو چند کلیات کے گرد گردش دیا کرتا تھا،

وفات | ان دماغی اشغال نے اگرچہ اس میں صفات عقلیہ کا ایک گونا گون عالم پیدا کر دیا تھا، اور اس میں جب علم، وقت نظر، ملکہ اجتہاد، اور اصابت رائے جیسے ضروری اوصاف پیدا ہو گئے تھے، تاہم اب وہ صحت جسمانی سے بالکل محروم ہو گیا تھا چنانچہ عمر کے آخری حصہ میں سخت بیمار پڑا جس سے اسکے تمام علمی مشاغل بند ہو گئے، اور اسکی بیوی کو تصنیف و تالیف میں اسکی مدد کرنا پڑی اس



زمانہ میں وہ اکثر اپنے باپ کا تذکرہ کرتا، اور اپنے لئے اسی قسم کی صحت کا خواستگار رہتا، لیکن انسان کی بہت سی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، بلکہ قبر تک اسکے ساتھ جاتی ہیں، اسلئے وہ بھی اس تمناء کے ساتھ ۸۸۲ء میں خاک کے سپرد کر دیا گیا، اس وقت اسکی عمر ۳۷ برس کی تھی،

اولاد | ڈارون کی اولاد کی تفصیل معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ ایک لڑکے کا نام فرنیس ڈارون تھا جس نے ۱۸۸۲ء میں اپنے باپ کی لائف لکھی اور خطوط جمع کئے،

فضل و کمال | ڈارون بہت سے علوم کا ماہر تھا، کالج کی زندگی میں اس نے انگریزی زبان کے علاوہ یونانی اور فرینچ زبانیں بھی سیکھی تھیں، اور علوم ادبیہ، جغرافیہ قدیم، تاریخ قدیم، شعر، اقلیدس، طب، کیمیا، تشریح، الہیات، ریاضی، جبر و مقابلہ، فلسفہ اخلاق، جیالوجی، علم النبات، بیالوجی، تصویر کشی، موسیقی وغیرہ میں کمال حاصل کیا تھا، ان میں سے اسکو تاریخ طبیعی کا بچپن سے شوق تھا، جو اخیر عمر تک قائم رہا، علوم ریاضیہ اور مادرات الطبیعیہ سے اسکو کبھی دلچسپی نہ تھی، اور اسلئے اس میں کامیاب نہیں ہوا، شروع سخن اسکو ابتداء بالکل ذوق نہ تھا، لیکن بعد میں یہ حالت ہوئی کہ جب ۱۸۲۳ء میں ویلس کا سفر کیا اور اسکے مناظر سامنے آئے تو اسکی قوت تخیل میں دفعۃً ایک ہیجان پیدا ہو گیا، لیکن بعد میں پھر اگلی حالت عود کر آئی اور شعرا کے تمام اشعار صفحہ دل سے محو ہو گئے، موسیقی اور تصویر کشی کا بھی یہی حشر ہوا۔

تصنیفات | ڈارون کی سب سے مشہور اور معسرکہ الاراء تصنیف "اصل الانواع" ہے، جس میں اس نے اس انداز سے بحث کی ہے جسکی اس سے بالکل امید نہ تھی، کیونکہ لوگوں کا اسکے متعلق یہ عام خیال تھا کہ وہ حقائق اشیا کا نہایت صحیح مطالعہ کرتا ہے، لیکن انکے علل و اسباب کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا، اس کتاب کے دیکھنے سے یہ خیال بدل جاتا ہے کیونکہ اس میں اس نے اصابت رائے اور ایجاد و اجتہاد کا نہایت عجیب و غریب منظر پیش کیا ہے جسکو علماء کی ایک بڑی تعداد نے تسلیم بھی کر لیا ہے،

ایک تصنیف "المجونات الصدفیہ" ہے، اس میں اس نے ان حیوانات سے بحث کی ہے جو

آبی پتھروں کی چٹانوں میں رہتے ہیں، اس کتاب کے شروع میں اس نے مقدمہ کے طور پر چند باتیں بیان کی ہیں اور انہیں پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے، یہ طریقہ ڈارون کے عام انداز تصنیف کے بالکل خلاف ہے کیونکہ وہ عموماً تقلید کے قید و بند سے آزاد رہنے کے لئے اپنے اصول میں تبدیلی پیدا کرتا اور قدماء کی تقلید کو ناپسند کرتا ہے،

ایک تصنیف اسکی خود نوشت سوانح عمری ہے جس سے ہم نے اس مضمون میں فائدہ اٹھایا ہے، ابتداء تصنیفات میں ہومر کے اشعار اور انجیل مقدس کا ترجمہ ہے جو اس نے یونانی زبان سے انگریزی میں کیا تھا۔

اسکے علاوہ اسکے پاس مضامین کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع رہتا تھا جسکی تعداد ۱۰۰۰ کے قریب تھی اور وہ مختلف عنوانات پر مشتمل تھے، چنانچہ جب اسکو کسی موضوع پر لکھنے کی ضرورت پیش آتی، تو ایک مرتبہ انکا مطالعہ کر لیتا تھا،

ڈارون نہایت کامیاب مصنف تھا، چنانچہ اسکی تمام تصنیفات اسکی زندگی ہی میں انگلستان اور تمام یورپ میں پھیل گئی تھیں،

اخلاق و عادات | ڈارون نہایت مذہبی آدمی تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی خدا کا خیال کرتا تھا، چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں جب گھر سے دوڑ کر کالج تک جاتا اور وقت پر پہنچتا تو اسکو خدا کا فضل و کرم سمجھتا تھا، وہ خود کہتا ہے کہ میں خدا کی نماز پڑھتا اور اس سے مدد مانگتا تھا، اور مجھے اپنی نماز کی مقبولیت پر بڑا تعجب ہوتا اور میں اپنی سعی و کوشش کو تیز دڑنے کے بجائے خدا کی طرف منسوب کرتا تھا۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق نماز پڑھتا اور اسکا پابند رہتا تھا،

فطرتاً نہایت رحمدل تھا، چنانچہ جب طبی کالج میں تعلیم پاتا تھا تو ایک دن دو شخصوں پر عمل جراحی کیا گیا چونکہ اس وقت تک بیوشی کی دوا نہیں ایجاد ہوئی تھی اور جیر ہاٹھ میں مریض کو سخت تکلیف



# مترجمہ

محمد تعلق کا طرز حکومت

(۳)

(از پروفیسر گارڈنبرگ اؤن)

چودھون صدی عیسوی میں اس عقیدہ کی نہ صرف ایک متین بلکہ ایک مقتدر جماعت بھی موجود تھی، اور مسلمانان ہند کی تمام آبادی سے اسے پوری تائید کی توقع تھی، کہ یہ لوگ دارالحکومت کے باشندے تھے، اور ہر دینی اسلامی ممالک کے طرز عمل سے قطعاً ناواقف تھے، تاہم ابھی تک مذہبی جماعت کو اتنا غلبہ نہیں حاصل ہوا تھا کہ نظم و نسق اور مہمات سلطنت کی باگ اسکے ہاتھ میں آجائے، زیادہ تر اس بنا پر کہ عموماً امرائے سلطنت نہ متعصب تھے نہ چند ان راسخ العقیدہ اور انکی ہمدردیان بادشاہ کے ساتھ یقین، جیسے مالی معاملات میں اب تک ایک بڑی حد تک آزادی حاصل تھی، مگر انہیں مخالف بنانے کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ انکے مخصوص منافع پر بادشاہ ایک مرتبہ ہاتھ ڈال دے،

مذہبی گروہ کے جو کچھ بھی مزعومات و معتقدات تھے، محمد تعلق کا طرز عمل ہر شے میں انکے مخالف تھا، بعض صورتوں میں اُس نے حکمرانان سابق کی تقلید کی، اور بعض معاملات میں اسے

۱۰ معارف، انگریز مورخین جنہوں نے ہندوستان کی ہمدردانہ اسلامی تاریخیں لکھی ہیں اور ان بادشاہوں کی حمایت و طرفداری کا جو بدنام سمجھا جاتے ہیں عجیب طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ ”درحقیقت وہ بادشاہ برے نہ تھے بلکہ اصل میں وہ جس مذہب کے پابند تھے وہ اچھا نہ تھا اور چونکہ وہ دیندار تھے اسکے احکام سے انحراف نہ کر سکے“ لیکن پول صاحب جنہوں نے عالمگیری کی مدافعت میں بہت کچھ کوشش کی ہے انکا بھی اس حملہ میں گارگرتیار یہی ہے پروفیسر گارڈنبرگ اؤن نے بھی محمد تعلق کی حمایت میں اسی طرز استدلال کو اختیار کیا ہے

ہوتی تھی، اسلئے ڈارون اس کمرہ کو چھوڑ کر ہباگ گیا، اور پھر کبھی جراحی کے وقت نہیں آیا،

نہایت سادہ دل اور نیک مزاج تھا، چنانچہ ایک مرتبہ ایک سانپ نے اسکو ہمراہ لیکر ایک دوکان سے کیک خریدا اور دام ادا کئے بغیر وہاں سے چل دیا، ڈارون نے سبب پوچھا تو بولا کہ میرے چچا نے ایک بڑی رقم اس غرض سے وقف کر رکھی ہے کہ جوڑ کا انکی پرانی ہیٹ پہن کر اسکو ایک خاص انداز سے حرکت دیگا تو اسکو ہر دوکان سے مفت چیزیں مل جائیں گی اور دوکاندار اس سے قیمت کا مطالبہ نہیں کریگا، اسکے بعد اس نے ہیٹ ہٹا کر دکھائی اور دوسری دوکان پر جا کر ایک اور چیز خریدی، ڈارون اسکی باتوں میں آگیا اور جب اس نے ہیٹ دیکر اسکو بعض چیزوں کے خریدنے کے لئے بازار بھیجنا چاہا تو فوراً راضی ہو گیا، چنانچہ ایک دوکان سے جا کر کیک خریدا اور قیمت ادا کئے بغیر وہاں سے چلے گیا، چونکہ دوکاندار اس سے بالکل ناواقف تھا اسلئے اس نے ڈارون کو پکڑ کر اس طرح دبوچا کہ اسکو اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا، اور وہ کیک کو دہین چوڑ کر بے تحاشا ہباگ نکلا، یہاں اسکا دوست اس مذاق سے لطف اٹھا رہا تھا، ڈارون پر نظر پڑی تو بے ساختہ ہنسنے لگا،

ڈارون، کھیلے کی طرح ذکی، فطین، طباع اور روشن دماغ نہ تھا، چنانچہ اسکے سامنے کوئی کتاب یا مضمون پڑھا جاتا تو وہ نہایت متاثر ہوتا لیکن اسپر تفتید نہیں کر سکتا تھا، اسی طرح وہ بہت دیر تک کسی خاص مسئلہ میں ٹھک نہیں رہ سکتا تھا، لیکن باہر بہت کوی رائے قائم کرتا تو اس میں اسقدر جدت، ندرت اور صحت ہوتی تھی جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے چنانچہ اس وصف کی نسبت خود کہتا ہے کہ ”میں اس پُر کی طرح نہیں ہوں جو ہوا کے جوہر کوں میں ٹہر نہیں سکتا۔“

غور و فکر کا عادی تھا، ہر چیز پر نہایت عمیق نظر ڈالتا اور تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔

حرفیوں سے سبقت لیجانے کا خیال اسکو ہمیشہ رہا کرتا تھا چنانچہ خود لکھتا ہے کہ ”مجھکو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ علماء طبیین میں کسی طرح ایک بلند درجہ حاصل کر لوں۔“



بالکل جدید راستہ اختیار کیا، وہ جانتا تھا کہ تخت کی عظمت و وقعت برقرار رکھنے کے لئے  
شان و شوکت از بس ضروری ہے کچھ تو اس خیال سے اور کچھ اس بنا پر بھی کہ وہ سلطنت کی  
مرقہ الحالی اور جدید اصلاحات کا خلوص کے ساتھ خواہشمند تھا، علاء الدین کی طرح وہ بھی اس  
امر پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ محاصل سلطنت کو چار شرعی طریقوں پر محدود رکھے، اسلئے اس نے  
لا محالہ انکے علاوہ اہل حرفہ اور پیشہ ورون پر ٹیکس جاری رکھے، اور شاہد بعض جدید ٹیکس بھی  
نکالے، گو اسکی کوئی خاص شہادت موجود نہیں، اس سلسلہ میں ہمیں پیشتر معلوم ہو چکا ہے کہ  
دو آب میں جب اس نے خراج دگنا کیا ہے تو کیسی سخت برہی پیدا ہوئی،

رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ، ان پر سختی و سخت گیری کیسی اس نے اکبر کے قبل ہی ایک طرز  
نوستی کی رسم کو مسدود کر دیا، دوسرے ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں  
اعلیٰ ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا، سب سے بڑا کمرشاید اسکا یہ جرم تھا کہ اس  
دولت مند ہندوؤں کی دولت و ثروت میں کچھ دست اندازی نہیں کی چنانچہ برہمنی کا  
زر قرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی مرقہ الحالی و ثروت  
میں اضافہ ہوا کیا، در آخر لیکہ یہ ایک راسخ العقیدہ حکمران کا فرض تھا کہ ان بد بختوں  
جو کچھ کہا یا پیا تھا، سب انکے منہ سے اگلا لیتا، ہندو حکومتوں کے متعلق شروع شروع  
اسکا طرز عمل بیشک یہ رہا کہ جنوبی ہند کی ریاستیں اسکی مورد عتاب رہیں اور بعد کو ہند  
قیدیوں کا ایک جم غفیر دہلی میں لا کر انکی ایک تعداد جہازوں پر بھر کر غلاموں کی حیثیت  
سے چین، ترکستان، روس، روانہ ہوتی رہی، لیکن یہ قصور اس سے ضرور ہوا کہ اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵) لیکن ہم کو یقین ہے کہ یہ مورخین اپنی تحقیقات سے جنگد مہون منت بنانا چاہتے ہیں  
وہ اس ننگ کو گوارا کر گئے، کیا انہیں سلاطین میں ایسے لوگ نہیں گذرے ہیں جو باوجود پوری دینداریکہ مورخین

ہتور اور منتہنیور کے راجپوتی قلعوں کی کوشش تسخیر کے بجائے، دور دور از ممالک کی فتوحات  
کے یہ قول برہمنی مجنونانہ منصوبہ باندھتا رہا، اور قدیم و جدید ہندو ریاستوں کو تیم خود مختاری  
کی حالت میں چھوڑے رکھا، اسکے اس طرز عمل کی دانشمندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں  
سکتے، جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں، اعلیٰ بذا اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ  
منتہنیور و ہتور کے قلعہ جات پر سیداضاعت نفوس کے بعد بھی مستقل قبضہ قائم رکھنے کی ناکامی  
کالیقین محمد تغلق کی عاقبت اندیشی کی دلیل ہے، تاہم اسکی یہ ساری کارروائیاں متعصب و پر جوش  
طبقہ میں سخت مردود ہیں، لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کا یہ طرز عمل رفتار زمانہ کے بالکل مطابق  
تھا، اور اس کا ثبوت ابن بطوطہ کے اس طنز آمیز لہجہ سے ملتا ہے، جس میں اس نے ایک  
ایسے مسلمان کا تذکرہ کیا ہے، جو ہندوؤں کا قتل واجب سمجھتا تھا، گویا اس عقیدہ کا شخص  
اس زمانہ کے لئے عجیب و غریب تھا،

غالباً علاء الدین پہلا شخص ہے، جس نے مال غنیمت میں حصہ حکومت کے قدیم تناسب میں  
تغیر کیا، اس نے اول بار جب خود مال غنیمت کا چھ حصہ لیا، اور سپاہ کو صرف ایک خمس دیا تو  
اس پر سپاہ میں سخت بغاوت پیدا ہوئی، مگر اس نے بغاوت کو بچہ آہنی سے فرو کیا، اور ہمارے  
علم میں کبھی دستور سابق کو بحال نہ کیا (یعنی جو جدید قاعدہ اس نے مقرر کیا تھا اس پر قائم رہا)  
خاندان تغلق کے دو ابتدائی فرمان رواؤں نے اسی قاعدہ کی تقلید کی، اور چودھویں صدی  
میں ہر سپاہی کو الگ الگ تنخواہ دینے کا دستور پڑ گیا جو زمانہ حال کے بہت کچھ مطابق تھا،  
گو سلاطین مغلیہ بھی اس جدید دستور کو رواج دیتے ہوئے بہت ہچکچاتے رہے، در آخر لیکہ  
سیاست نامہ میں (جو قرون وسطیٰ کے اسلامی دور حکومت کے نظم و نسق کا ایک گنجینہ ہے) اسکی  
کافی تعریف و توصیف موجود ہے،



موجودہ نظم سب سے ایک مسئلہ ہے کہ بادشاہ کو محاصل سلطنت میں سے اپنی ذات کے لئے اسی قدر یا اس سے کچھ زائد لینا چاہئے، جتنا اسکی رعایا میں بڑے سے بڑے عہدہ داروں کو ملتا ہے، لیکن قرون وسطیٰ میں یہ تخیل ہی دشوار تھا، انگلستان تک میں تاجداروں اور پارلیمنٹوں کے درمیان اس مسئلہ پر مدتوں سخت ترین معرکہ آرائیاں رہیں پھر پہلا سلطان دہلی سے اس اصول پر عمل درآمد کی کیونکر توقع ہو سکتی تھی، اور خصوصاً علاء الدین و محمد تغلق سے!

مذہبی عدالت کی قائم کردہ فرد جرم کا آخری عنوان یہ ہے کہ اس نے عدالتی کارروائیوں میں مداخلت کی، مسلمانوں کو سزائے موت سے مستثنیٰ نہ رکھا، اور سادات کے تقدس کا لحاظ نہ رکھا، ان تمام الزامات کے لئے ہمیں اسی قدیم جرم یعنی سلطان کی شقاوت کی طرف رجوع کرنا چاہئے، لیکن یہ یاد رہے کہ آج جس سلطان کو ہم "خون آشام" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اسکا لقب خود اسکے زمانہ میں بلکہ اکبر کے عہد تک "عادل" تھا، اور سلطان کو فرائض عدالت میں انہماک تھا، نیز جس خاموشی کے ساتھ وہ اپنے مخالف فیصلوں کے آگے گردن خم کر دیتا تھا یہ سب واقعات اسکے "عادل" ہونے کے زبردست شواہد ہیں، لیکن اسنے ایک قدم اس سے آگے بڑھایا، اور مذہبی عدالت کی نظر میں ہی اسکا ناقابل عفو جرم ہے، اس نے مرافقہ کے لئے عدالت عالیہ خود اپنی ذات کو قرار دیا، اور جب کبھی اسکی رائے عدالت ماتحت کے مفتیوں کی رائے سے مختلف ہوتی تو پہلے وہ اسکی کوشش کرتا کہ وہ مفتی صاحبان ہی اپنے فیصلوں میں ترمیم کر دیں، لیکن جب اس میں ناکامی ہوتی تو وہ اپنا حکم سنا دیتا، اور مفتیان شرع کے احکام مسترد کر دیتا، اس سے بڑھکر یہ کہ اس نے فصل خصومات کا کام اپنے بعض ایسے مستدار کان کے سپرد کر دیا تھا جو نہ قاضی تھے، نہ مفتی، نہ فقیہ، اس موقع پر بیشک یہ اعتراض

ہو سکتا ہے کہ ان واقعات کے اسکی شقاوت و سفاکی سے کیا تعلق؟ اسلئے ہم بھی دو ایسے امور کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنکا تعلق اسی الزام سے ہے، پہلا مسئلہ باغی سرداروں کے ساتھ برتاؤ کا ہے، سلطان کے زمانہ میں بارہ بغاوتیں فرد کی گئیں، سات میں سلطان ذاتی طور پر شریک تھا اور پانچ اسکے افسروں کے ہاتھ سے، اول الذکر سات بغاوتوں میں ایک کا سرغنہ میدان میں کام آیا، ایک مفرد ہو گیا، اور پانچ کو معافی دی گئی، البقیہ پانچ بغاوتوں میں سے چار کے سرغنہ دُن کو سلطان کے افسروں نے بغیر اسکے ایماء و استمرازج کے قتل کر دیا، صرف ایک کے قتل کا البتہ معقول وجوہ و اسباب کی بنا پر خود سلطان نے حکم دیا، کیا ان واقعات سے سلطان کی سفاکی کی کچھ بھی تائید ہوتی ہے؟ اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ متعین واقعات ہیں جنکی بنا پر مورخین نے سلطان کو خون آشام قرار دیا ہے، اس قسم کی پندرہ مثالیں پیش کی گئی ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ ان پندرہ میں سے ایک نظیر تو سلطان کی خاص رحمدلی کی ہے، دو محض اتفاقی واقعات ہیں، اور دو کا سلطان کی ذات سے مطلق تعلق نہیں! سب سے بڑھکر تماشہ کی بات یہ ہے کہ بقیہ واقعات میں کم از کم آٹھ مثالیں ایسے اشخاص کی ہیں، جن میں مقتول مذہبی یا فقہی جماعت کا رکن تھا، اور اکثر مثالوں میں اس پر اصلی الزام صریح بغاوت و غداری یا اوقات مذہبی میں تغلب و تصرف کا تھا، سلطان جو اپنی شقاوت و سفاکی کے لئے اس قدر بدنام ہے اس کا راز پس یہی ہے، اس ظالمانہ تعزیرات کے دور میں محض خوزیری کوئی حیرت انگیز واقعہ نہ تھا، البتہ رعایا کا ہر طبقہ اپنے فرمان روا کی اس جبریت و بیباکی پر ششدر رہ گیا، کہ وہ کسی سید یا مشرع شیخ پر ہاتھ ڈالنے میں بھی تامل نہیں کرتا، گویا سلطان کی اصلی خطایہ نہ تھی کہ وہ سخت مزاج تھا، بلکہ یہ تھی کہ اسکی عدالت گسٹری ہر طبقہ و فرقہ کے لئے یکساں و مساوی تھی، اور جب کسی پر جرم ثابت ہو جاتا تھا، تو



بحرم کا علم و فضل، عالیٰ نبی، بلندی مرتبہ، تشرع و تقدس، ان میں سے کوئی شے بھی واجب تہذیب سے محفوظ رکھنے کے لئے اسکی غنیمت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ طبقہ جو ہمیشہ سے اپنے تئیں قانون کی گرفت سے محفوظ و مصون سمجھتا چلا آتا تھا، اسکی نظریں یہ دور حکومت بیشک ہولناک تھا اور سلطان عادل ہنن بلکہ سفاک تھا!

اگر سلطان کی پالیسی کی مخالفت صرف اسی طبقہ تک محدود رہتی تو یہی سلطان کی نیکنامی قائم رہ سکتی تھی، لیکن دو امور ایسے پیش آ گئے، جن میں سلطان کے خیالات و رفتار دماغ کے بالکل مخالفت تھے، ان میں سے پہلی بات یہ ہوئی کہ اس نے سرحد سے متعلق قدیم دستور العمل کو بالکل بدل دیا، ایک صدی تک مغربی صوبجات پر مغلوں کی فوج کشی برابر ہوتی رہتی تھی، یہاں تک کہ پنجاب جو ایک زمانہ میں اپنی درخیزی کے لئے مشہور تھا، اب ویران ہو چلا تھا، اور سلاطین دہلی کو سب سے مقدم فکر اسی کی تھی، کہ کسی طرح اس یلغار کا سد یاب کیا جائے، رفتہ رفتہ نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ خود پایہ تخت تک مکر خطرہ میں آ گیا تھا، اور اسکی حفاظت کے لئے محاذ کی حیثیت سے ایک جدید عہدہ قائم کرنا پڑا، ایسی حالت میں قدیم انجمن جماعت کو یہ دیکھ کر کافی صدمہ ہوا کہ ان محافظوں میں سے آخری محاذ کے فرزند نے ان قابل نفرت اعداء سے دوستی پیدا کر لی! لیکن اس تغیر صورت کے لئے سلطان کے پاس کافی وجوہ موجود تھے، اسلئے کہ مغلوں میں اب خود اندرونی مناقشہ شروع ہو گئے تھے، اس لئے ان میں سے جو جماعت سب سے زیادہ بر قوت تھی اسکے ساتھ مصالحت کر لینا خالی از نفع نہ تھا، اسکے علاوہ اس قبیلہ چغتائیہ اور اسکے فرمان روا ترنسٹرین نے اسوقت تک اسلام بھی قبول کر لیا تھا اور اسلئے اب ان سے مصالحت و معاشرت ناجائز بھی نہ تھی، سلطان کی اس سادہ مین جو مصلحت شناسی تھی اس کا سب سے بڑا ثبوت

یہی ہے کہ اسکے بعد یہ یورشیں موقوف ہو گئیں، لیکن سلطان کی اس مصالحت پسندی سے گو جنگی یورش بند ہو گئی، لیکن ایک دوسرے قسم کا یلغار شروع ہو گیا، اور برنی کیساتھ ہو کر یہ ذکر کرتا ہے کہ اس عہد میں اجنبی جوق جوق ہندوستان میں داخل ہونے لگے، اور یہاں ہاتھوں ہاتھ ان کا استقبال ہونے لگا! لیکن یہ کیا غضب ہے کہ برنی بگڑ بگڑ کر انکے داخل ہند اور استقبال پر اعتراض کرتا ہے، لیکن باوجود ایک پختہ مسلمان ہونے کے اس واقعہ کو پی جاتا ہے کہ یہ بیچارے محض قبول اسلام کی بنا پر اپنے ملک کے مظالم سے تنگ آ کر ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے!

برنی کا سارا غصہ سلطان کے دوسرے جرم، یعنی اسراف پر ہے، یہ درحقیقت ایک عجیب بات ہے کہ برنی کی نظر میں سخاوت و فیاضی بھی جرم ہے اسلئے کہ تمام معتبر شہادتوں کا اس پر اتفاق ہے کہ سلطان کی فیاضیاں اسراف کی حد تک نہ تھیں، بلکہ محاصل سلطنت کے بالکل مناسب تھیں، البتہ زیادہ چہان بین سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان فیاضیوں کے مورد اکثر اہل ملک ہنن بلکہ غیر ملکی ہوتے تھے، ایسے غیر ملکی جو اسکی ملازمت میں داخل ہوتے تھے یا داخل ہونے والے ہوتے تھے، اور یا وہ جنگو کسی خاص کمال یا وصف کی بنا پر سلطان اپنی ملازمت میں لیتا چاہتا تھا، اس سے ظاہر ہے کہ سلطان سے یہ شکایت ذاتی حیثیت سے تھی، اسکی فیاضی بجائے خود معیوب نہ تھی، البتہ یہ جرم ضرور تھا کہ اسکا صرف غیر ملکیوں پر ہوتا تھا! سلطان کے اس رجحان طبع کی یہ توجیہ کافی نہیں کہ سلطان خود بھی تو غیر ملکی تھا، جسکے اسلاف ہندوستان میں پہلی صدی کے خاتمہ پر داخل ہوئے تھے سلطان کا مقصود اصلی یہ تھا کہ کسی طرح نظام سلطنت درست و بہتر ہو، ملکی عہدیدار علیٰ العموم نااہل و ناتجربہ کار تھے، اس لئے لامحالہ اسے ایران و مغربی ایشیا سے ارکان حکومت بلاتا پڑتے تھے



کہ وہاں کی خوش نظمی مسلم تھی، علاؤ الدین نے اپنے زمانہ میں جتنے افراد کو کاروبار سلطنت میں ہوشیار کرایا تھا، ان میں سے بعض اپنی موت طبعی سے مرچکے تھے، بعض کو اس نے اپنے آخر زمانہ میں خود قتل کرایا تھا، اور باقی قطب الدین و شہر خان کے زمانہ میں ختم ہو گئے۔ ایک طرف اشخاص کا یہ قحط تھا، دوسری طرف ضروریات سلطنت روز افزون تھیں، ایسی حالت میں سلطان کے لئے بجز اسکے چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو ہمسایہ ملک ایران سے اشخاص کو بلائے یا اپنی ملکی رعایا کے ان طبقات سے انتخاب کرے، جو اب تک مناصب جلیلہ سے بالکل الگ رہے تھے، یہ دونوں صورتیں قدیم خاندانی عہدہ داروں کی برہمی کا باعث ہوئیں، علی الخصوص پہلی صورت کہ عین الملک کی بنیاد بالآخر ملکوں اور غیر ملکوں کی طاقت آزما فی کا میدان ثابت ہوئی، سلطان جو خوش انتظامی کا دلدادہ تھا، اس پر اس طرز عمل سے کوئی حرف نہیں آسکتا، تاہم ان واقعات سے اسکے خلاف برہمی کی علت غائی پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے،

حالات و اسباب بالا کی بنا پر رعایا کے دو پُر قوت طبقہ سلطان کے پورے دشمن ہو گئے تھے، ایک مذہبی گروہ، دوسرے ملکی عہدہ داروں کی جماعت، اور سلطان نے جو فرمان رواں مصر کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا، ممکن ہے کہ اس میں بھی اسکی یہ مصلحت ہو کہ ان مخالفانہ اثرات کی قوت کسی حد تک تو زایل ہو سکے، لیکن اگر ایسا تھا، تو اپنے منصوبہ میں وہ ایک حد تک ناکام رہا، اور یہ عجیب شومی قسمت کہ سلطان کے آخری ایام میں جو اہم بنیادیں ہوئیں، وہ انہیں غیر ملکی عہدیداروں کی بہڑ کاٹی ہوئی تھیں اسوقت انکی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں، صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ جبوقت سندھ کے ریگستان میں سلطان کی عمر و حکومت دونوں کا خاتمہ ہو رہا تھا، اُسی وقت سے مذہبی گروہ میں یہ گہری شادمن

ہونے لگی کہ اسے معزول کر کے اسکی جگہ پر اسکے کمزور و مطیع الفقہاء چچا زاد بھائی کو تخت نشین کیا جائے، ایک لحاظ سے یہ انتخاب بہت بجا تھا، چنانچہ چون چون مانہ گز ناگیا اور سلطان محمد تغلق کے تربیت دادہ ارکان دولت جوق جوق اُٹھتے گئے، اسی قدر فیروز شاہ علمبرداران تشرع و تقشف کے دیر اثر آتا گیا اور اس سے بہت قبل کہ تیمور آکر دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے، خاندان تغلق کی حکومت کے کل پرزے ایک ایک کر کے الگ ہوتے گئے۔

آخر میں مختصراً موضوع غور صرف دو سیرتیں رہ جاتی ہیں، ایک برہنی کی، دوسرے سلطان کی، مباحث بالا سے غالباً یہ نتیجہ ناظرین کے ذہن میں پیدا ہوا ہوگا، کہ جس شخص نے اپنے آقا کو اس قدر سچا بدنام کیا اسکی بنفسی میں کیا کلام ہو سکتا ہے، لیکن یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے یہ الزامات لگائے ہوں ممکن ہے کہ اس نے (کم از کم اپنے نزدیک) دیانتہ لگائے ہوں، خوب غور کر کے دیکھو کہ یہ شخص جو، ابرس تک سلطان کا ایک معتد عہدیدار بلکہ اسکے آخری ایام میں اسکا مشیر کار بھی رہ چکا تھا، اس نے اس مدت کے بعد اپنے تئیں کیسا پریشان، بے روزگار و حقیر پایا ہوگا! فیروز شاہ کے جلوس کے وقت جو ہنگامہ انقلاب برپا ہوا غالباً اسی لپیٹ میں اسکی معاش بھی جاتی رہی، اور اسکے بعد پانچ برس کی مدت یعنی تاریخ عہد تغلق کے آغاز تحریر تک اسکا بجز اسکے اور کیا مشغلہ رہا ہوگا کہ دن بھر بے روزگاری کی حالت میں مضمل و افسردہ بیٹھا ہوا اور سابق کے واقعات و حالات پر غور کیا کرتا ہوگا؟ اسکے بعد جب وہ تاریخ کے لئے قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو اگرچہ اپنے مرحوم آقا کے محاسن ذاتی و کمالات کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، بلکہ ایک مقام پر تو سلطان مرحوم کی ایک اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے اسکے تاریک صفحات بھی جوش مدح سے روشن ہوتے لگتے ہیں تاہم ایک پختہ تشریح مسلمان کی تقدیر پرستی کے ساتھ وہ اس خیال



پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عہد سابق کے مصائب خدا کی نافرمانی کا نتیجہ تھے، اور سلطان نے مرضی الہی کے خلاف کارروائیاں کیں، اور اسی خیال کی مطابقت میں وہ تاریخ لکھنا شروع کر دیتا ہے وہ غریب ہندوستان کے باہر کے حالات سے قطعاً نادان تھا ہے اور چونکہ سلطان زیادہ مشورہ نہیں طلب کرتا تھا، اسلئے اسکی نیت و پیش نظر مقاصد کی توضیح بھی برنی پر فرض نہ تھی، غرض اس طرح اسکی تاریخ نیم ارادی و نیم اضطراری تعصب سے رنگ جاتی ہے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسوقت کی حکومت اسکی تاریخ کو عہد سابق کی مستند سرکاری تاریخ سمجھنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جب اسکی وفات ہوتی ہے تو فیروز شاہ بہ صد حسرت و یاس کہتا ہے کہ "کانش میرے عہد کی تاریخ بھی کوئی ایسا ہی شخص لکھتا"!

اب یہی سلطان کی سیرت، یہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان کے جوہر ذاتی و اہلیت کے متعلق معاصرین کی کتنی بلند رائے تھی، یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ سترہویں صدی کے اوایل تک اسکی بابت یہ حیثیت تحریر میں ہے کہ "وہ فرمانروا جو آج تک عادل کے لقب سے مشہور ہے" پھر یہ بھی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اس پر جو سخت سے سخت الزامات ہیں وہ لا جواب نہیں، اس حالت میں کیا ہمیں جو عام رائے اسکی بابت شائع ہے اسے قبول کر لینا چاہئے، اور اس کے مزار پر کتبہ لگا دینا چاہئے کہ "بہایت قابل مگر بہایت ناکام" ایسا فیصلہ یقیناً نامنصفانہ ہوگا، اسلئے کہ اس میں غیر مساعد اتفاقات کو کیسے نظر انداز کر دیا گیا ہے، مثلاً علاقہ دو آب میں اتفاقہ ٹیکس کے بعد طویل قحط، یا زرفرضی کے چلنے میں غیر متوقع دقت، تسخیر خراسان کے وقت دفعۃً اتحاد دین کی اعانت سے محرومی، حکومت کی ابتدائی ۲۰ سالوں میں پورے پانچ سال کا قحط وغیرہ، ان مخالفت اتفاقات و حالات کے مقابلہ میں قرون وسطیٰ کا کون سا حکمران کامیاب رہ سکتا تھا؟ پھر آخر

یہ کہان کا انصاف ہے کہ ناسازگاری بخت کا بھی سارا الزام اسکی کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جائے، خواہ اس سے اسکے دشمنوں کو کیسی ہی خوشی ہو، لیکن کیا اس شق کو چھوڑ کر وہ کسی اور حیثیت سے بھی ناکام رہا ہے؟ ممکن ہے کہ اسکے جواب میں بنگال و دکن کے علاقہ جات کا اسکے ہاتھ سے نکل جانا پیش کیا جائے، لیکن یہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جب ہم ان حقائق کو فراموش کر جائیں کہ

(۱) بنگال پر دہلی کی حکومت شاہ ذوالقدر ہی کبھی رہی تھی، اور اسکو بھی بنگال نے انتہائی نفرت سے دیکھا تھا،

(۲) تسخیر دکن کا پورا قصد تھا، لیکن یہ قصد وقت فوقتہ ملتوی ہوتا رہا، تا آنکہ موت نے ہر قہر بلکہ خود سلطان ہی کو محو کر دیا،

(۳) اسکے معاوضہ میں سلطان نے کاٹھیا دار کو تسخیر کر کے بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کو اپنے لئے محفوظ کر دیا۔

ساتھ ہی ہکو یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے، کہ کتنی عظیم الشان اور کاواک سلطنت کا بار اسکے سر تھا، جس میں متدین و قابل عہدیداروں کا قحط تھا، ایسی حالت میں اس نے ایک جدید طرز حکومت اختیار کیا، یعنی وہی طرز حکومت جسکی بنا پر ہم اکبر کی داد دیتے ہیں، اس نے شہوت تعلیم کا نظام قائم کیا، شفا خانہ جاری کرائے، محتاج خانوں اور اعانت غریب پر توجہ کی، نوراعت کو ترقی دی، پھر اگر ان حالات کے ساتھ ہندوؤں کے ساتھ اسکی بے تعصبی و رواداری کا طرز عمل اسکے لئے باعث بدنامی ہوا، تو بجز اسکے کہ "اے رشتی طبع تو برسن بلا شدی" پڑھ کر خاموش ہو رہا جائے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا،

سلطان کی سیرت و طرز عمل کی بابت قول فیصل اسی کی رائے کو سمجھنا چاہیئے جو قدیم



مورخوں نے اسکی بابت ٹائم کی ہے، اس باب میں ہمیں مورخین حال کے تفتیح سے احتراز کرنا چاہیے، جنگی رائے نامہ متعصب برنی کے سرسری مطالعہ اور فرشتہ کے غیر مستند انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے، ایسے لوگوں کی نظر میں سلطان یقیناً مجنون یا مراثی یا مطلق العنان مستبد فرمانروا ہوگا، لیکن اس طرح کسی کا نام نکال لینا اپنے تئیں متصفانہ تحقیق، بے لاگ رائے، اور نفس بشری کے طریق کار کی واقفیت سے معرئی ثابت کرنا ہے، اسکے مجنون ہونے کا تو اسکے معاصرین میں کوئی بھی مدعی نہیں، رہا اسکا مراثی ہونا سو اسکی تردید میں اسکے متعدد عملی اور پر قوت کارنامہ موجود ہیں، مستبد بیشک وہ تھا لیکن استبداد کے سوا قرون وسطیٰ میں کوئی اور طریق حکومت کسی کے تخیل میں بھی تھا؟ اسکے استبداد کو یہ طور کسی خاص جرم یا اخلاقی مرض کے پیش کرتا اس حقیقت سے اپنی جہالت کا ثبوت دیتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تسلیہ برائے نام ہوتی ہے اور جمود و تاریک خیالی کا دور دورہ ہو جاتا ہے، ایک ایسا مستبد فرمانروا جو جدید تجاویز و خیالات کو قبول کر سکتا اور اصلاحات پر آمادہ ہو سکتا ہے وہ اپنی رعایا کی خوشحالی میں بہت کچھ اعزاز کر سکتا ہے، البتہ ایسے حکمران کو اپنے زمانہ میں سخت دقتوں کا سامنا ہوتا ہے، قدیم خود غرضیوں کی بیخ کنی اور لوگوں کی قدامت پسندی خواہ مخواہ اسکے بہ کثرت دشمن پیدا کر دیتی ہے، ملازمین و عہدیدار جبکہ سران ناگوار جدید اصلاحات کا نفاذ ہوتا ہی وہ اسکا بار اپنے آقا کے سر ڈال دیتے ہیں، اور اس راہ میں اگر کوئی اتفاقی ناکامی پیش آجاتی ہے، یا نا اہل و خائن عہدیداروں کے باعث اسکیم میں خامی رہ جاتی ہے تو اسکا سارا وبال مستبد فرمانروا کی گردن پر عاید کر دیا جاتا ہے پھر اگر اتفاق سے کسی معمولی جنگ کے دوران میں اسکی موت آجاتی ہے (چنانچہ محمد تعلق نے بھی شہر شہید کی فصیل کے نیچے دفن پائی) تو فوراً اس عام فتویٰ پر منشا ایزدی کی بھی مہر لگ جاتی ہے، اسکے بعد جب اسکے

عہد کی تاریخ لکھنے کے لئے وہ لوگ قلم اٹھاتے ہیں جبکہ جذبات یا اغراض کو اسکی اصلاحات سے کافی صدمہ پہنچ چکا ہو، تو لائحہ عمل اسکی نیت پر حملہ کئے جاتے ہیں، اسکے محاسن و کمالات پر پردہ ڈالا جاتا ہے اسکے کارنامہ مدہم کر کے دکھائے جاتے ہیں، آخر میں چلکر نکلنے سے کہ حق و راستی معاشرانہ باطل پرستی پر غالب آجائے، لیکن جو اقترآت زبان زد عوام ہو جاتے ہیں اور جو اکاذیب صدیوں کی عمر پانچکے ہیں انکی پردہ دری بھی آسان نہیں۔

یہی صورت اس عالم، مہذب، و پر قوت فرمان روا کے لئے بھی پیش آئی ہے جو بکسین اور ناتوازون کا خاص طور پر حامی و مددگار تھا، لیکن جسے تاریخ کے صفحات نے بہ کمال بید روی "سفک" کا لقب بخشا ہے جو شے اسے سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی جو کتبہ اپنی قبر کے لئے وہ سب سے زیادہ پسند کرتا وہی بات اسکی موت سے کچھ پیشتر ہی ایک دور دراز ملک کے ایک باخبر و منصف مزاج مصنف کی زبان قلم سے نکل گئی، قرطبہ (اسپین) سے پکن (چین) اور کریمیا سے ممباسات تک شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جسکی سیاحت ابن بطوطہ نے نہ کی ہو، اور محمد بن تعلق کی متعدد کارروائیوں سے اسے اچھا خاصا اختلاف تھا، پھر جس تاحدار کی رفاقت چھوڑ کر وہ مغرور ہو گیا تھا، اس سے اب اسے کسی حسن سلوک کی بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی، برہنہ اپنے وسیع تجربات کی بنا پر اسے بھی یوں نڈارا بغاظ لکھنا پڑے، جسے افسوس ہے کہ ہم آسانی سے بھلا دیتے ہیں :-

"تمام اشخاص سے زیادہ یہ بادشاہ منکسر و متواضع ہے، اور تمام اشخاص سے زیادہ یہ عدل کو ملحوظ رکھتا ہے"

(اس مضمون کے راقم پر و فیسر گارڈنبرگ ڈون ایم۔ اسے اس مضمون کا مسودہ ختم کرتے ہی بغیر اس پر نظر ثانی کئے دفاتر گئے)

(یوپی، ہسٹاریکل جرنل)



## تَلَخِيصٌ وَتَبْصِرَةٌ

### مذہب و اصلاح نظام تمدن

مسٹر آڈمنڈ ہوس اس وقت انگلستان کے اُن چند مشاہیر فضلاء میں ہیں، جنکی وقت نظر و وسیع افق موافقین و مخالفین سب کو تسلیم ہے اور جو ملکی، مذہبی و قومی تعصبات سے اپنے تئیں جدا مکان بکر اُزا کر چکے ہیں، فنِ تعلیم و تربیت، نیز مذاہب مشرقیہ پر انکی متعدد تصانیف موجود ہیں، اور انکی ہر ہر سطر مصنف کے اجتہاد و فکری کی گواہ ہے، یورپ کے سنجیدہ طبقہ میں آجکل سب سے زیادہ دُرُکِ یہ مسئلہ ہے کہ جنگ کے بعد نظام تمدن و معاشرت کی تجدید کن اصول پر ہو؟ اس موضوع پر مسٹر موصوف نے بھی رسالہ تالیف فرمایا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ نظام تمدن کی صحیح اصول پر اصلاح و تجدید ناممکن ہے تا وقتیکہ پہلے مذہب مروجہ کے پیدا کردہ تخیلات و عقائد کی جو فضاے کائنات پر محیط ہو گئے ہیں اصلاح و تصحیح نہ ہو سکے۔

مسٹر موصوف فرماتے ہیں کہ جس تمدن مادی پر ہیں ناز تھا، جنگ عظیم نے اسکی بنیادیں تک متزلزل کر دی ہیں، وہ نظام تمدن جو فوج کے سپاہیوں اور پولیس کے پیادوں کے بل قائم تھا، ہر جگہ شکست ہو رہا ہے چنانچہ متعدد ممالک میں تو اس کی جگہ بد امنی، حکومت کی جگہ لاکھوتی، اور خوشحالی کی جگہ قحط و افلاس نے صریحاً لے لی ہے، اور جن ممالک میں اب تک بہ نسبت نہیں آئی ہے وہاں بھی مختلف طبقات کی ہنگامہ آرائیان اور شور و شین کسی آئینہ انقلاب عظیم کی خبر دے رہی ہیں، ہر طرف خود غرضی، حرص و طمع، مسابقت، حسد و منافرت کا دورہ ہے اور اس عظیم الشان تلاطم و طوفان میں انسانیت کی کشتی تہ دبالا ہو رہی ہے اور قریب

کہ ان سخت تہیڑوں سے بالکل چور چور ہو جائے،

ان مصائب سے محفوظ رہنے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے سیاسی جماعت کا ہر فرقہ، ہر گروہ، ہر طبقہ اپنی اپنی عقل و پیش بینی کے موافق ایک جدید تجویز اصلاح پیش کرتا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود ان تجاویز اصلاح میں بجد اختلاف ہونے کے تعلیم و مذہب کو ہمت نہ لگانے پر سب کا اتفاق ہے! حالانکہ نظام تمدن کی اصلاح بغیر صحیح اصول تعلیم کے گویا عمارت بغیر بنیاد، اور بغیر صحیح اصول مذہب کے، عمارت بغیر نقشہ تیار کرنا ہے؟ جس طرح بغیر نقشہ قائم کئے عمارت کی بنیادیں ٹک نہیں رکھی جاسکتیں، اسی طرح ہر تمدنی اصلاح سے پیشتر مذہب کا صحیح تخیل بھی لازمی ہے، مکان کا نقشہ بناتے وقت کمین اپنی تمام آئندہ ضروریات راحت و صحت، صفائی، استحکام، خوشنمائی، کفایت، وغیرہ کا لحاظ رکھتا ہے اور اسی کے مطابق نقشہ تیار کرتا ہے، اسی طرح مذہبی خاکہ تیار کرتے وقت بھی ہمیں آئندہ کی تمام تمدنی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہئے، اسلئے کہ مذہب ہر شعبہ زندگی پر حاوی و محیط ہے، یہاں تک کہ نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح بھی اسکے دائرہ سے الگ ہو کر نکل نہیں

مذہب کی تعریف میں گواہل مذاہب کہتے ہی مختلف الگاموں، بہر حال اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہب سب سے بڑی حقیقت کی جسے مذہبی اصطلاح میں خدایا معبود کہتے ہیں ایک تعبیر ہے، پس عام اس سے کہ ہم مذہب کے قایل ہوں یا منکر، اپنی کسی اسکیم میں اس سے بڑی حقیقت سے قطع نظر نہیں کر سکتے، بلکہ جہاں تک ہماری یہ تعبیر درست ہوگی اسی نسبت سے آئندہ سہولتیں ہوتی رہیں گی، اور اگر ہمارا نظام تمدن ناکام ثابت ہو چکا ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس عمارت کا بنی نقشہ تھا، وہ ناقص تھا، یعنی حقیقت عظمیٰ کی تعبیر یا خدا کا جو تخیل ہمارے ذہن میں قائم تھا وہی سرے سے غلط یا ناقص تھا۔



جو لوگ وجود باری کے قائل نہیں، انکے ذہن میں خدا کا تخیل دہی طرح پر آسکتا ہے لیکن یہ کہ خدا ہماری ذات سے الگ اور ہم سے خارج ہیں، دوسرے یہ کہ ہمیں میں شامل اور ہمارے اندر ہے، لیکن علامہ اب تک کس خدا کو مانتے رہے ہیں؟ خدا اے خارجی کو، وہ خدا اپنے کائنات کا مافوق الفطرت خالق، اور فرمان ردا اے غیر مسکول ہے، اب تک عموماً ہمارا عقیدہ یہ رہا ہے کہ ہم ایک ضعیف البیان و گنہگار مخلوق ہیں، البتہ ہمارے خالق مطلق الاختیار نے کبھی کبھی اپنے بعض برگزیدہ بندوں کو اپنے اور ہمارے درمیان خدمت پیامبری کے لئے چون لیا ہے، انہیں منصب رسالت و نبوت پر سرفراز کیا ہے ان پر صحیفے نازل کئے ہیں، اور انکے ذریعہ سے ہم تک اپنے ارشادات پہنچائے ہیں، اسی بنا پر ہر مذہب نے اپنا ایک مخصوص خدا قرار دے لیا ہے اور ہر مذہب والا اپنی جگہ پر یہ یقین رکھتا ہے کہ نجات صرف اسی مذہب کے لئے ہے، اور باقی اہل مذاہب گمراہ دہنمی ہیں۔

یہ لے یہاں تک بڑھی کہ خارجیت و ظاہریت کا اثر ہماری مذہبی زندگی کے ایک ایک جز پر چھا گیا، اور نہ صرف مذہبی بلکہ معاشری و اخلاقی زندگی بھی انہیں عقاید کے سانچے میں ڈھل گئی، ہر فرد کے دل میں یہ تئنا رہنے لگی، کہ خدا کی خوشنودی مزاج اسی کے حصہ میں آئے، ہمارا خدا گویا تخت عرش پر بہ طور ایک مطلق الاختیار و فرمان ردا اے غیر مسکول کے متمکن ہے اور ہر مذہب حسنات آخرت اور ہر حسنات دنیا کے لئے اسکی پیشگاہ میں عاجزانہ و خوشامدانة التجا کر رہا ہے اور ان دعاؤں کی استجابت اسکے ایک اشارہ چشم پر موقوف ہے، برکات نبوی و دنیوی کے جتنے سرچشمہ ہیں، نجات اُخروی و فلاح دنیوی، عزت، دولت، حکومت وغیرہ کے عطا کرنے والے جتنے مجازی خدا ہیں وہ ان سب کا خدا ہے، وہ جسے چاہتا ہے دم بھر میں عزت دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے دم بھر میں ذلت دیتا ہے، امارت و افلاس، حکومت و محکومی، صحت و بیمار

عزت و ذلت کی تقسیم اسکے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرے، اور اسکی تقسیم پر ہر بندہ کو تسلیم ختم کر دیتا چاہئے گویا مخلوقات بد نصیبوں اور خوش نصیبوں کے دو گروہوں میں منقسم ہے۔ خدا اور خدائی کے متعلق یہ تخیل تھا، جو معاشری زندگی کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے، اور یہی نظام اب درہم برہم ہو رہا ہے، بد نصیبوں نے اپنی حالت پر قناعت رکھنا چھوڑ دیا ہے، اور خوش نصیبوں کے ملوکات پر یہ زور قبضہ حاصل کرنے کا ہتھیار کر لیا ہے اور اسی نے ہیئت اجتماعی میں تلاطم کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایک خارجی خدا کی پرستش کرنا ایک امر محال کی سعی کرنا ہے "رشتہ عبودیت" اور "خارجیت مطلق" باہم متناقض ہیں، اور ان دونوں کا اجتماع محال عادی و محال عقلی ہے "خارجی خدا" کا وجود اگر ماننا ہی ہے تو اسکا بہترین مظہر داخلی خدا کو تسلیم کرنا چاہئے، اور اس سے زاید ہستی باری کی کٹہہ و ماہیت کی جستجو میں نہ پڑنا چاہئے، پرستش و عبادت کے قابل بھی داخلی خدا ہے جو خارجی خدا کی طرح عرش اعلیٰ پر متمکن نہیں، بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہمارے نفس کے اندر اور ہماری روح کی گہرائیوں میں جاری و ساری ہے، نہیں، بلکہ یہی داخلی خدا ہماری اصل حیات اور حقیقی روح ہے، یونیک و بد، زاہد و فاسق، ہر شخص میں موجود ہے اور حیات انسانی تا مگر اسی کا ایک پرتو، اسی کی ایک جلوہ آرائی ہے۔

یہی من سے مساوات انسانی کا مسئلہ بھی حل ہوا جاتا ہے، جب تمام افراد اپنی اصل، یعنی جلوہ گاہ ہستی باری ہونے کے لحاظ سے یکساں مساوی ہے، تو ظاہری و فرعی فردی و اختلافات ان میں کوئی عدم مساوات نہیں پیدا کر سکتے، اس عقیدہ کے لحاظ سے تمام افراد روحانی حیثیت سے باہم برابر اور انہ تعلق رکھتے ہیں، جس میں کسی طرح کے جبر و تشدد کو مطلق دخل نہیں ہو سکتا، پہر چونکہ ہر فرد کے مقصد حیات کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے۔



جب اُسے بلا مزاحمت پورے نشوونما و بالیدگی کے مواقع حاصل رہیں، اور ان مواقع کا حصول گرد و پیش کے طرز معاشرت و حالات سیاسی پر ایک بڑی حد تک مشروط و منحصر ہے اسلئے ہر فرد کو قدرۃً یہ حق حاصل ہے کہ وہ امور سیاسی و معاشری کی تنظیم و تشکیل میں اپنی بھی ایک آواز رکھے، اور حکومت پر فرض ہے کہ اس آواز پر کان رکھے، جمہوریت کی صحیح و مستحکم بنیاد یہی ایک عقیدہ ہو سکتا ہے، اسکے سوا کسی اور بنیاد پر نظام جمہوریت قائم کرنا گویا ریگ کے ذرات پر عمارت تیار کرنا ہے،

افراد کی تکمیل حیات میں انکی روحانی ترقی بھی شامل ہے، روحانی ترقی کا سب سے پہلا زمینہ یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو مٹائے، ایشیا سے کام لے، اور دوسروں کی خدمت فرض عین سمجھے، ارتقاء روحانی کی سب سے مقدم تدبیر یہ ہے کہ من و تو کی تفریق مٹ جائے اور بنائے جنس کی مینفرضانہ خدمت اسی طرح اپنے اوپر فرض سمجھی جائے، جس طرح خود اپنی ضروریات و خواہشات کا پورا کرنا ہوتا ہے، جو لوگ خارجی خدا کے بجائے داخلی خدا کی عبادت کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ من و تو کی تفریق محض سطحی و ظاہری ہے کہ اصل حقیقت کے لحاظ سے تمام بنی آدم ایک ہی جوہر لطیف کے مختلف شئون و مظاہر ہیں، اور جب قلب کو یہ اذعان حاصل ہو جاتا ہے تو لامحالہ خودی، خود پسندی و خود بینی کے جذبات مٹ جاتے ہیں، اور انسان کسی کو غیر نہیں بلکہ سب کو ”اپنے“ ہی میں شامل کرنے لگتا ہے۔

لیکن روحانی ترقی کا جو یہ طریقہ بتایا گیا، بہترین نظام معاشرت کا راز بھی یہی ہے ہر فرد اگر دوسرے کی خدمت و اعانت اپنا فرض سمجھنے لگے مغایرت و بیگانگی کا خیال اگر مٹ جائے تو دنیا سے مناقشہ و منافہ کا بھی اہی خاتمہ ہو جائے، حکومت و تمدن کا مقصد یہ ہے کہ افراد مسرت و راحت کے ساتھ معیشت رکھ سکیں، اور اسکے لئے ضروری ہے کہ

افراد بغیر کسی خارجی مزاحمت کے آزادانہ اپنا مکمل حیات کر سکیں، اور یہ مکمل سب سے زیادہ ضبط نفس خدمت خلائی، اور خود فراموشی ہی سے ہو سکتا ہے،

دنیا میں اس وقت ایسی صورتیں رائج ہیں، جسکے ذریعہ سے افراد کی خود غرضیوں کو دبایا جاتا ہے، مثلاً حب وطن، حب قوم وغیرہ، لیکن درحقیقت ان میں سے کسی طریقہ سے افراد کی خودی و نفسانیت نہیں دور ہوتی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ افراد بجائے اپنے ذاتی فوائد کے قومی اغراض و ملکی فوائد کو پیش نظر رکھتے گتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے قزاقوں کے گروہ میں ہر فرد باوجود انتہائی شقاوت و بداخلاقی کے اپنے گروہ کے فوائد کو اپنے ذاتی خواہشات پر مقدم رکھتا ہے، اس غرض کا صرف اصلی علاج وہی ہے جو اوپر مذکور ہو چکا، یعنی افراد کے ذہن میں یہ یقین مسلط ہو جائے، کہ عمر بنی آدم اعضا سے یکدگر اندر،

اور اس حقیقی رشتہ اتحاد کے سامنے ملک و قوم، مذہب و ملت کے امتیازات تمام تر سطحی ہیں، وطنیت، قومیت یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر مفید ہیں، بشرطیکہ انہیں انسانیت پر غالب نہ آنے دیا جائے، اور سب پر بالا تر اخوت انسانی کو رکھا جائے، مثلاً جو محبان وطن آج وطن پرستی کے جوش میں بخود ہو کر دوسرے ممالک سے جنگ شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح بغیر ارادہ خود اپنے وطن کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں، اگر اخوت انسانی کا خیال ان پر مستولی ہوا تو ایسے خطرات سے ہمیشہ کے لئے امن ہو جائے،

غرض یہ کہ اگر آئندہ کشمکش سے بچنا، اور امن کی برکات سے مستفید ہونا ہے تو افراد کو اپنے نشوونما میں پوری حریت حاصل رہنا چاہئے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ذہن میں بجائے ایک عرش نشین خارجی خدا کے اس داخلی خدا کا اعتقاد ہو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں پڑا جگہ گارہا ہے،



قدیم خود غرضانہ طرز معاشرت کو ترک کر کے ایشیا، خلوص، و غیر ضعی کو دلیل حیات بنانا  
 آج ہم سب پر فرض ہے اور ہم میں سے تقریباً ہر شخص کافی مشق و کوشش کے بعد اپنے میں یہ خصائل  
 پیدا کر سکتا ہے تاہم جو لوگ اپنی عمر کی بختگی کو پہنچ چکے ہیں ان کے مقابلہ میں بچوں کو یقیناً ان خصائل کے  
 اخذ و اكتساب میں بہت زائد سہولت ہوگی، اس لئے ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ آئندہ نسل کی  
 تعلیم و تربیت کا خاص طور پر انتظام انہیں اصلاحی اصول کے مطابق اپنے ہاتھ میں لین،

لیکن اس وقت مدارس اور تعلیم گاہوں کی کیا حالت ہے؟ وہی عرش نشین خدا کا تخیل یہاں  
 بھی بنیر اپنے زہریلی نتايج کے نہ رہا، اسی خدا کے نمونہ پر تعلیم گاہوں کے اندر ہر اسناد چھوٹے پیمانہ  
 پر ایک مطلق الاختیار و غیر مسئول خدا ہوتا ہے اور اُس کے چکر دنیا میں اس خارجی خدا کے جن مظالم  
 کا شکار ہونا پڑتا ہے ان سب کا ایک ایک کر کے بچپن ہی کے زمانہ میں تجربہ کر دیا جاتا ہے، بچوں کو  
 خطری آزادی سے محروم کر کے زیر دستی انہیں پڑھنے بٹھایا جاتا ہے، جبر و تشدد کے تمام طریقے  
 عمل میں لائے جاتے ہیں، کبھی خفگی پڑتی ہے، کبھی سزا ملتی ہے، اور کبھی دم دلاسا کے ساتھ  
 رشوت کا نوکر کیا جاتا ہے، پھر ترغیب و تشویق کے طریقے کیا استعمال کئے جاتے ہیں؟ امتحانات  
 انعامات، گویا ہر کچھ کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دوسرے بچے اُس کے حریف و دشمن ہیں، اور اُسے ہر  
 سرکہ میں انہیں نیچا دکھانا چاہیے، جو بچہ ناکام رہتا ہے، اُس کے ساتھی اُسے ذلیل سمجھتے ہیں اور  
 اور جو کامیاب ہوتے ہیں وہ فخریہ اکر تے پھرتے ہیں، اور اس طرح ہر مدرسہ بجائے خود رشک و  
 حسد، مقابلہ و مکابہ، خود پسندی، فحاری کی ایک درس گاہ ہوتا ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہر کچھ  
 کی قوت ارادی شکست کی جاتی ہے، اسکی حریت قدم قدم پر محدود کی جاتی ہے اسے مصنوعی  
 قواعد و ضوابط کے شکنجہ میں جکڑ دیا جاتا ہے، اور نفس کشی و ایشیا کا اسے بہوے سے بھی کوئی  
 سبق نہیں دیا جاتا، خود اعتمادی کے بجائے اُسے دوسروں پر بھروسہ اور تکیہ کرنا سکھایا جاتا ہے،

خارجیت اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کی جاتی ہے، اُس کا مذاق فاسد کیا جاتا ہے، اور ہر ممکن  
 طریقہ سے یہ نقش اُس کے ذہن پر بٹھایا جاتا ہے کہ بجائے اپنے نفس و ضمیر کے فتوے کے اُسے دوسروں  
 کی ہدایت پر عمل کرنا چاہئے!!

اس طرز تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر کچھ خود غرض، خود پسند، خود مین ہو کر رہ جاتا ہے، اور گوشہ نشین  
 آخر تک اُسے بشمار استادوں سے سابقہ پڑتا ہے، غیر محدود معنائیں کو دماغ میں محفوظ رکھنا پڑتا ہے  
 اور ایک لاتعداد ادبنا کتابوں کا اُلٹنا پڑتا ہے، لیکن یہ سبق اُس کو بچپن سے جو انی تک ایک موقع پر  
 بھی نہیں ملتا، کہ

”مصرف نفس انہیں کو حاصل ہوتی ہے، جو اپنی خودی کو گم کر چکے ہیں“

اُس کا مطیع نظر مادی لذت و راحت رہ جاتی ہے اور روحانی سکون و سرور کی طرف اسکا خیال  
 بھی نہیں جاتا،

آخر میں ایک بار پھر کہنا پڑتا ہے کہ ان سارے مفاسد کا ذمہ دار وہی عرش نشین  
 خارجی خدا کا تخیل ہے جو ہر شے میں غیر مسئولیت اور مطلق الاختیاری ڈھونڈتا ہے یہ خلافت  
 اس کے داخلی خدا کا عقیدہ رکھنے والا جاتا ہے کہ اُس ہستی مطلق کے بشمار شئون و مظاہر میں اسکا  
 کوئی ایک مخصوص مذہب نہیں، صداقت و خلوص کہیں بھی ہو اُس ہستی مطلق کو محبوب  
 ہے، اُس کے نزدیک کوئی جماعت ہیترم جہنم نہیں، بلکہ سب اپنی اپنی استعداد و بصیرت کے  
 مطابق منزل مقصود کے جانب حرکت کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کو نیک نفسی رواداری، فراخ دلی،  
 اخوت، مساوات، خلوص و ایشیا کے لئے کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں،

معارف، کیا یورپ میں بھی ظاہری العقیدہ اور قائمین وحدۃ الوجود فرقوں کا وجود ہے؟ بہر حال  
 اس جنگ عظیم میں متحد یورپ کو کسی نوع کے خدا کا تو یقین آیا چاہے وہ عامیانه تخیل کا ہو، یا صوفیانہ،



## احسان علیہ

سرچارلس لائل، جو متعدد شعرا عرب کے دوا دین اور اسکے انگریزی تراجم شائع کر چکے ہیں، حال میں ان کے زیر اہتمام کیمبرج یونیورسٹی پریس سے کلیات عمر بن قتیہ شائع ہوا ہے، یہ شاعر قیس بن ثعلبہ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جو قبیلہ بکر بن دابل کی ایک شاخ تھا اور امیر القیس کا معاصر اور رفیق سفر تھا، کلیات کا بیشتر حصہ عمر کے دیوان پر مشتمل ہے، جس کا قلمی نسخہ کچھ روز ہوئے قسطنطنیہ کی مسجد سلطان قاجار کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا تھا، اور اسکے علاوہ بعض متفرق نظمیں مختلف ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں، سرچارلس لائل کلیات کا اصل متن اور انگریزی ترجمہ دونوں شائع کر رہے ہیں۔

سال گذشتہ میں ہندوستان میں جتنے اشخاص نے اپنی ایجادیں پیش کر رکھی تھیں انکی مجموعی تعداد ۶۴۳ تھی، اور ان میں ۵، ہندوستانی تھے، جن میں ایک نام مہاراجہ سندھیا (والی گورکھ) کا بھی نظر آتا ہے، ان ایجادات کے بعض عنوانات کے ماتحت انکی تعداد حسب ذیل تھی :-

(۱) کہانا پکارتے سے متعلق، ۲۶

(۲) برف جماتے اور سرد کرنے سے متعلق، ۹

(۳) قوت کھربانی سے متعلق، ۵۹

(۴) فرنیچر سے متعلق، ۱۷

(۵) طب و جراحی سے متعلق، ۲۷

(۶) ریل و ٹراموے سے متعلق، ۱۰۸

(۷) موٹر وں سے متعلق، ۲۹

(۸) نمک سازی سے متعلق، ۱۰

(۹) عام اوزار سے متعلق، ۱۷

(۱۰) قفل سازی سے متعلق، ۲۸

(۱۱) گیس اور تیل سے متعلق، ۷

مہاراجہ گوالیار کی ایجاد ایک خاص قسم کی جھولنے کی کرسی ہے،

—•—

پیرس کے ڈاکٹر دورڈون، اور امریکہ کے ڈاکٹر کیلبر نے حال میں یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ انسان کے مردہ ہونے کے ساتھ ہی دفعۃً تمام جسم پر اجل طاری نہیں ہو جاتی، بلکہ حرکت قلب کے رک جانے کے بعد بھی پورے اٹھارہ گھنٹہ تک ہڈیوں کی زندگی برقرار رہتی ہے، اور مختلف غدود دن میں تین سے لیکر چھ گھنٹہ تک انکی فعلیت قائم رہتی ہے، پھر چونکہ مختلف غدود قیام حیات میں خاص طور پر معین ہوتے ہیں، اسلئے جوان عمر و تندرست اشخاص کی تازہ نشون سے غدود بذریعہ عمل جراحی نکال کر زندہ اشخاص کے کام میں بہ آسانی لائے جاسکتے ہیں، فرنیچر پر و فیسر دورڈون کے یہ دعاوی محض نظریہ کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن امریکہ کے ڈاکٹر کیلبر نے ایک قدم اور بڑھا کر ان پر عمل و تجربہ شروع کر دیا ہے، اور اب تک خاصی کامیابی ہو رہی ہے، پروفیسر موصوف کی تجویز ہے کہ اس مقصد کے لئے مخصوص اسپتال کھولنے چاہئے، تاکہ تندرست اشخاص کی تازہ نشین دہان جلد سے جلد لا کر اسکے کارآمد اعضا خصوصاً غدود بذریعہ عمل جراحی نکال کر زندوں کے کام میں لائے جائیں،



امریکہ کے نامور جرنل ہورس کارپنٹر جنھوں نے ابھی وفات پائی ہے، انکی جائیداد کی کل قیمت ۷۲۱۲۰۰ پونڈ (اکڑور ۸۲ لاکھ روپیہ) نکلی، یہ ساری رقم انکے وصیت نامہ کے مطابق تین امریکی یونیورسٹیوں میں تقسیم ہو رہی ہے، نیویارک کے ایک اور متونی ریس مسٹر یعنی، ۱۰ ہزار پونڈ (دیر ۷ لاکھ روپیہ) کا ترکہ یوسٹن یونیورسٹی کے لئے چھوڑ گئے ہیں،

\*

سہارن کے کسی پچھلے نمبر میں اطلاع دی جا چکی ہے کہ اشریات ہند پر مسٹر ہری کرشن کارمل بہترین قرار پایا، اور انہیں پٹنہ مورل کا تمغہ انعام دیا گیا، یہ رسم رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کی عمارت میں انجام پائی اور اسکی صدارت ڈاکٹر ونشٹ اسمتھ نے کی، جنگی مارچ ہند پر متعدد ضخیم تصانیف موجود ہیں، اور جو انگلستان میں تاریخ ہند کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں، ڈاکٹر موصوف نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ سائل متعلقہ ہندو قدیم کی بابت اسوقت ایک بڑی جماعت تحقیق و تفتیش میں مصروف ہے، جس میں ایک کافی تعداد خود اہل ہند کی ہے، مثلاً ڈاکٹر موصوف نے دو ہندوستانیوں کے نام خصوصیت کے ساتھ پیش کئے، ایک پروفیسر جادو ناتھ سرکار جنگی نامت م "مارچ عہد اور نگ زیب" ایک عظیم الشان تاریخی کارنامہ، اور نادر دہلی کتب تاریخ وغیرہ سے ماخوذ ہے، دوسرے پروفیسر کرشنا سوامی اینکار (مدراں) جو دجیانگر کی قدیم تاریخ حیرت انگیز تحقیقات و تفحص کے ساتھ مرتب کرنے میں مصروف ہیں،

مسز ٹلی نے اپنے شوہر متونی کی یادگار میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں معاشیات کی تحصیل تکمیل کے لئے ایک معقول ذلیقہ ٹلی اسکالرشپ کے نام سے قائم کرایا ہے اور اس غرض کے لئے یونیورسٹی کو ۲۰ ہزار پونڈ (تین لاکھ روپیہ کا عطیہ) دیا ہے۔

مسٹر کارگل نے گلاسگو یونیورسٹی سے خواہش کی ہے کہ طبیعات عملی کی تعلیم کے لئے ایک جداگانہ لکچر شپ قائم کی جائے اور اس مقصد کے لئے ۲۰ ہزار پونڈ (تین لاکھ روپیہ) کی رقم یونیورسٹی مذکور کے خزانہ میں جمع کر دی ہے،

—

قاسم کے پرچہ کو کب کو مسٹر احمد شاکر الکرمی اطلاع دیتے ہیں، کہ مشہور نایاب کتاب ابوالعلا مسری کی فصول والغایات کا جز اول سید محب الدین خطیب کو ہاتھ آگیا ہے یہ کتاب قرآن کا جواب سمجھی جاتی تھی اور اس بنا پر اسکے محفوظ رہ جانے کی توقع نہ تھی، چنانچہ قوت نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، کہ ایک مقدس ہتھم کتب خانہ کو کہیں سے اسکا ایک نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا جسے اس نے تلف کر ڈالا، اس سے پیشتر اسکے بعض متفرق اجزاء پروفیسر مارگولیس نے ابوالعلا کی تصانیف کے تبصرہ میں نقل کئے تھے، اس جدید انکشاف کا علمی دنیا میں نہایت شوق سے خیر مقدم کیا جائے گا،

(پروفیسر مارگولیس اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل)

—

مشہور مکتشف و مجتہد سائنس سر جے، سی، بوس جنگی ردانگی یورپ کا تذکرہ نمبر کے معارف میں آچکا ہے، کئی ہفتہ ہوئے انگلستان پہنچ گئے اور وہاں کی متعدد سائنٹفک مجالس اور انجمنوں کے سامنے اپنے جدید افکار و اعمال کے نتائج پیش کر رہے ہیں، جن پر ٹائمز اور دوسرے مقتدر اخبارات حیرت کا اظہار کر رہے ہیں، ایک مجلس میں جو زیر صدارت مسٹر بالفور (چانسلر کیمبرج یونیورسٹی) منعقد ہوئی تھی، بوس نے بیان کیا کہ انھوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے نباتات کی شرح غور یافت ہو جاتی ہے جو بمقابلہ سست سے مسرتہ رنگنے والے جانور کی شرح رفتار کے ۱۰۰۰ گنا ہے!



# انجیٹا

## رباعیات حالی

غیر مطبوعہ

برداشت مولانا حمید الدین صا از مولانا حالی

دولت کی ہوس اصل گدائی ہے سامان کی حرص، بینوائی ہے یہ  
حاجت کم ہوا تو ہے یہ شاہنشاہی اور کچھ نہ ہو حاجت، تو خدائی ہے یہ

محنت سے وصول چار بیسے ہوں اگر کرا شرفیوں کی نیولی پر نہ نظر  
یہ کچلی مین بھرا ہوا سانپ ہی سانپ ہاں سوچ سمجھ کے ڈالنا ہاتھ ابیر

## فریاد اکبر

ابتداء عالم ہستی مین مین بیہوش تھا ہوش جب آیا تو دل مین غفلت لگا بوش تھا  
پھر مصائب اور فنا کے تجربے میہم ہوئے بعد ازاں جب تک جیا منہم تھا خاموش تھا  
اک بھر بیکران ہے حوادث کا سلسلہ الجھا جو دہن اس مین وہ دیوانہ ہو گیا  
اٹھے مورخین زمانے مین گم ہوئے افسانہ گو جو تھا وہ خود افسانہ ہو گیا  
فنا کے سامنے ہم کیا ہماری ہستی کیا برائے نام مگر اک نشان پا ہی لیا  
ہوا جو ہنفس، قطرہ تنگی دم بہرہ جباب نے بھی خودی کا مزا اٹھا ہی لیا  
انتظامی بات ہے یہ ہوتی آئی ہے یونہی اسکا کیا شکوہ جو ہم پر اسکو غالب کیا  
ہاں یہ ہوا فوس مہمے چہن گیا صبر و قرار طالب حق کو فلک نے اسکا ظالم کیا

# جنگو

از مولوی اقبال احمد ہیل ایم اے ایل ایل بی

اے شرارِ مظلوم اے برقِ بیتاب زین شمع کچھ گلستان، روشن دلِ مہر نشین  
پہنچتا ہے شعلہ احساس کیون ہے بیقرار کسکی شمعِ حسن پر برتا ہے تو پروانہ فنا  
منظر کس کا ہے تو اے دیدہ بخواب کہہ جستجو کسکی ہے تجھ کو کرکے شبِ تب کہہ  
کہہ تو اے الماس پران کیلئے منظرِ تو ہے حقیقت تیری کیا کس کان کا جو ہر تو  
پہنچتا جنگو یہ مین تیری ہی آتش باریاں یا تصادم سے ہوا کے اڑتی مین چنگیاں  
کہہ رہے مین اہل گردوں تیرا جلوہ دیکھ کر گر پڑے کیا خوشہ پر دین کے دانہ خاک پر  
جگمگا اٹھا ہے پاکستان یہ تیرے نور سے آتش نے شعلہ زن ہے یا رگ انگوڑے  
البتہ ایام کا بیشک تو نور العین ہے نور و ظلمت روز و شب کا مجمع البحرین ہے  
شعلہ تبکراہ نکلی ہے درونِ خاک سے یا سرکش نشان ہے انجم دیدہ فناک سے  
ہے حصارِ چرخ پر یہ شعلہ باری کیلئے جنگ یہ فوج کو اکبے ہے جاری کیلئے



# بَابُ الْفَيْضِ وَالْإِنْفِاضِ

## رسالہ علم نباتات

از مولوی عبدالحی صاحب ندی بی ایس، سی

رسالہ علم نباتات جسکی اشاعت کے لئے ہم انجن ترقی اردو کے ممنون ہیں، اسوقت ہمارے سامنے اس سے پہلے اسی انجن نے ایک اور کتاب مبادی سائنس شائع کی تھی جسکا ایک حصہ علم النبات کے لئے مخصوص تھا، جس تیز رفتاری کے ساتھ تمام علوم عموماً اور فنون حکیمہ خصوصاً میدان ارتقار میں کام زن ہیں، اسکا اقتضایہ تھا کہ اب تک اس فن پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہوتی ہیں، لیکن ہم تمدن کے کئے مطالبات پورے کر چکے ہیں کہ اسکی شکایت کریں،

رسالہ علم نباتات نہایت سلیس اور سنجھی ہوئی زبان میں لکھا گیا ہے اور اس میں حتی الامکان اصطلاحات کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے، اور یہی ایک ابتدائی کتاب کے لئے شایان بھی تھا، یہ رسالہ درحقیقت علم النبات کے چند مسائل کی ایک جہلک دکھا دیتا ہے، اور اس فن کے مہمات مسائل بھی اس میں پورے طور پر نہیں ذکر کئے گئے،

علم النبات پر ایک مستقل تصنیف اسوقت مکمل ہو سکتی ہے جب اس میں تمام اعضائے نباتیہ کی ظاہری تشریح، ہر قسم کے سینخون کی خوردبینی تشریح، اسکے کیمیائی تاثرات و کیمیائی رکازات، افعال اعضا، طریقہ تغذیہ، نمو و تناسل اور توضیحی تجارب، نباتات پر ماحول کے اثرات مستقل و غیر مستقل اور نباتات کی تنوع اور انواع و اصناف کے باہمی ارتقائی تعلقات کا ذکر کیا جائے، اور ہر نوع کے ایک پودے کو لیکر اسکی سرگزشت حیات تفصیل سے بیان کی جائے، اسی کے ساتھ ہی خانہ (cell) کی تشریح

دقیق اور نشاۃ ادلی (morphology) کے مظاہر حیاتیہ و خصائص پر ایک نظر ڈالی جائے، اور پھر فلسفہ علم الحیات کے مہمات مسائل بیان کئے جائیں اور ارتقا، نوریت و افتراق کے متعلق ڈارون، ڈی وری، اور گیلیئن کی مساعی جمیلہ نے جن مظاہر حیات کو بے نقاب کیا ہی وہ ملک کے سامنے پیش کئے جائیں۔

اگرچہ دو تقلید مانع ہوتی ہیں اس کے ساتھ یہ نہایت ضروری ہے کہ حقیقی مثالین بیان کی جائیں وہ حتی الامکان ہندوستان کی پیداوار میں سے ہوں تاکہ براہ راست مشاہدات کئے جاسکیں، اگر یہ نہ ہو تو علم النبات پر نئی تحقیقات کی امیدیں رکھنا عبث ہوگا، اور چونکہ مثال ہمشل اس سے زیادہ خفی ہوگی اسلئے مسائل کا سمجھنا بھی دشوار ہو جائیگا۔

اشکال جو علم الحیات کے مضامین سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں انکا اوسط اس رسالہ میں تقریباً ۱۰ فی صفحہ ہے، یورپ میں اس فن پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان میں اشکال و تصاویر کی کثرت و صحت کا نہایت اہتمام کیا جاتا ہے، متوسط درجہ کی نباتیات کی درسی کتابوں میں اشکال کا اوسط فی صفحہ تقریباً ۱۰ سے ایک تک ہوتا ہے،

ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ رسالہ مشتمل نمونہ از خرد اس سے زیادہ نہیں ہے، لیکن جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے، اسکی نظم و ترتیب کی ستائش نہیں کی جاسکتی۔

تہید کے بعد پہلے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پودوں کی قسمیں الگ الگ کیونکر ہوتی ہیں، اس میں نباتات کے ارتقا اور انکی تنوع کا نہایت مجمل اور سرسری بیان ہے۔

دوسرے باب میں پودوں کے کھانے کا ذکر ہے، اس میں اول پتوں کے افعال اور پھر انکی ساخت اور پھر ساخت پر ماحول کے اثرات بیان کئے گئے ہیں اور پودوں کی تقسیم باعتبار عمر کے کی گئی ہے، طریق تغذیہ کے لئے جن تجارب کا بیان کرنا اس باب میں ضروری تھا وہ چھوڑ دیئے گئے



اور محض پتوں کی تشریح پر اکتفا کی گئی ہے، پتوں کی ساخت پر ماحول کے اثرات اور پودوں کی تقسیم پر  
مضامین اس باب میں ذکر کئے گئے ہیں وہ ترجمۃ الباب کے تحت میں کسی طرح نہیں آتے،

تیسرے باب میں پودوں کے پینے کا ذکر ہے انہیں جڑوں کے افعال اور ظاہری ساخت و  
طریقہ جذب، حل کیائی، پروٹوپلازم اور مخضرہ کا ذکر ہے، اسکے بعد پودوں کی نامکمل تنولج کی گئی ہے  
اسکے بعد نو صفحے اسکی تشریح میں صرف کئے گئے ہیں کہ باغبان پودے کے بڑھنے کے لئے زمین کا خیال  
کیون کرتے ہیں اور ہوا کا خیال کیون نہیں کرتے، اسکے بعد پودوں پر آب دہوا کے اثرات بیان کر  
کئے ہیں، ابتدائی نو دس صفحوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تو عنوان باب کے تحت میں آسکتا ہے  
باقی تیس بیستیس صفحے عنوان سے بالکل بے تعلق ہیں، بلکہ اسکے بعض مباحث مثل حل کیائی اور  
تشریح کہ باغبان پودے کے بڑھنے کے لئے زمین کا خیال کیون نہیں کرتے، علم النبات سے تھوڑا ہی  
تعلق رکھتے ہیں، اس باب میں بھی تجارب بہت ہی کم اور بالکل نامکمل ہیں،

باب چہارم و پنجم میں پودے کی تلقیح، اور تلقیح کے طریقے بیان کئے گئے ہیں اور باب ششم میں  
یہ بیان کیا گیا ہے کہ پودے اپنے بیجوں کو کس طرح پھیلاتے ہیں، یہ آخری تین باب نسبتہ اچھے لگے گئے ہیں  
علم النبات کی ایک اوسط درجہ کی کتاب کا جو خاکہ ہم دیکھتے ہیں، اسکے ساتھ اس رسالہ کے  
مضامین کا مقابلہ کرنے سے اسکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب کتنی نامکمل ہے،

کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم ان افسوسناک مسامحات و اغلاط کا کچھ ذکر کرنا چاہتے  
ہیں، جنہوں نے اس کتاب کی قیمت کم کر دی ہے،

اشد خارجی کی کثرت | سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ اس رسالہ کی زیادہ تر مثالیں یورپ کے  
اشد وطنی کا فقدان | پیداوار سے اخذ کی گئی ہیں، شاید اس رسالہ کے ناظرین سے یہ توقع کی گئی ہے کہ  
وہ علم النبات کے مطالعہ کے لئے یورپ کی میا بان نوردی اختیار کریں گے، ہندوستان کی مشین

مثالیں نظر انداز کر کے یورپ کی مثالیں اختیار کرنے کے چند نمونے ہم پیش کرنا چاہتے ہیں،  
صفحہ ۲۶ میں پنجہ نام مرکب پتوں کے بیان میں ہارس چپٹنٹ، ورجینیا اور اسٹرابری کے  
پتوں کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ سینہل، کپاس امریکی کانپوری، ارہر، موٹہ اور پٹا جو ہندوستانی  
پودے ہیں انکی شکل کو مغربی پودوں سے بہتر ظاہر کر سکتے تھے،  
صفحہ ۲۷ میں ایک قسم کے پرنا پتوں کے ذکر میں بلیڈا سنا کا حوالہ دیا گیا ہے اور صرت ہے کہ  
آم، جامن، کیلا، مچ، گل عباس ایسے ہزار ہا ہندوستانی پودوں میں سے کوئی مصنف کے  
تخیل کو مائل نہ کر سکا۔

صفحہ ۲۸ میں اسپینی چپٹنٹ کے بجائے مکوہ، کیٹلہ، جنگلی گوبھی، اور گل عباس یا شاہ بلوط  
کے بجائے شلم دھولی، مرتج کے بجائے اٹلی، بول اور سرہو کہ وغیرہ ہم ہندوستانیوں کو زیادہ  
سمجھا سکتے تھے،

صفحہ ۳۰ میں آلو بخارا کے بجائے شفتالو، بیر گل ہندی وغیرہ زیادہ مناسب تھے۔  
صفحہ ۳۲ میں تیرنا پتوں کی کوئی مثال نہیں دی گئی، حالانکہ ہندوستان میں ایسے پودے بکثرت  
موجود ہیں، منجملہ انکے کوڑیا ہی ہے جسکے سفید قیف نام پھول صبح کو میدانوں میں ہر شخص کی توجہ کو اپنی  
جانب مائل کر لیتے ہیں،

کرم خور پودوں کے بیان میں کافی تطویل سے کام لیا گیا ہے اور سات پودوں کا حال بیان  
کیا گیا ہے، جنہیں سے سواد و ایک کے جو شملہ اور نینی تال پر ملتے ہیں، اور کوئی ہندوستان میں نہیں  
پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اس پودے کا ذکر نہیں کیا گیا، جو ہندوستان کی میدانی جیلوں میں  
بکثرت پایا جاتا ہے، چنانچہ لکھنؤ کے قریب چنہٹ جیل میں بھی وہ بکثرت موجود ہے۔

صفحہ ۷۸ میں ناشپاتی کے پھولوں سے مثال دی گئی ہے اور اس سے زیادہ مشہور اور متداول



مثالین چھوڑ دی گئی ہیں،

باب پنجم و ششم کی مثالین بھی زیادہ تر مغربی ہیں، حالانکہ اس باب میں نباتات ہندوستان کے کچھ کم دلچسپ رہتے، مثلاً لیکسی، کپاس، مدار، کنیر، گنگاچی، ڈسموڈیم، خرفہ، چلچل، کالا بچوا، پنوار، ناریل اور سلویا وغیرہ،

یہ تو سمجھات تھے، اب افلاطون کو ہم پانچ عنوانوں پر تقسیم کر سکتے ہیں، ہر عنوان کے تحت میں ہم چند مثالین بیان کرینگے، (۱) تیمم ماحقہ تخصیص (۲) تخصیص ماحقہ اتیم (۳) نظریات و مابہ الزام سائل کا یقینات کی حیثیت سے ذکر کرنا، (۴) ایسے افعال و خواص کا ثبوت جو بے اصل ہیں، (۵) غلط تعریفین اور تقسیمین،

تیمم ماحقہ تخصیص ”اگر ہم کسی پھول کو نگاہ غور سے دیکھیں تو اس میں ذیل کے پائین گے، پھول کے وسط میں جو عضو ہوتا ہے اسے بولی کہتے ہیں، یہ وہی عضو ہے جسے ذریعہ سے تولد نسل ہوتی ہے، اسکے کئی حصے ہوتے ہیں، پچلا حصہ گولی کی طرح گول ہوتا ہے جسکو بیضہ دان کہتے ہیں، بیضہ دان کے ارد گرد باریک دھاگے کے مانند ڈنڈیاں ہوتی ہیں جسکو نالی کہتے ہیں، اسکے سرے پر ایک ظرف ہوتا ہے جس میں زرد رنگ کا زیرہ ہوتا ہے“

”پھر اگر ایک ہی پودے میں زرد مادہ پھول دونوں ہوں تو کم از کم ایک شاخ کا فاصلہ ضرور ہوتا ہے دونوں قسم کے پھول ایک ہی شاخ پر نہیں ہوتے۔“

تخصیص ماحقہ اتیم | ان میں سے ہر ایک خانہ پھر دو خانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور جب تک کافی مقدار میں کاربونک ایسڈ گیس اور روشنی ملتی رہتی ہے یہ تقسیم جاری رہتی ہے،

نظریات و مابہ الزام سائل کا ”جتنے پودے دنیا میں پائے جاتے ہیں خواہ وہ درخت ہوں یا جھاڑی یقینات کی حیثیت سے ذکر کرنا یا گاس پات سب ایک ہی مورث اعلیٰ سے پیدا ہوتے ہیں۔“

”ہر ایک پودا بذات خود واحد نہیں ہے بلکہ ایک بستی کی طرح اس میں بہت سے افراد ہیں“

ایسے افعال و خواص کا ”اگر ہم پتے سے ایک نہایت باریک ٹکڑا کاٹیں اور خوردبین سے دیکھیں تو ثبوت جو بے اصل ہیں ہم اوپر کے حصے میں ایک حصہ چوٹے چوٹے خانوں کا پائین گے جسکے چاروں طرف نہایت صاف و شفاف دیواریں ہونگی، یہ خانے پانی سے بھرے ہوتے ہیں اور پتے کے اوپر پانی کے روکنے کا کام دیتے ہیں اور کاربونک ایسڈ کو جو ہوا میں پھیلی ہوتی ہے، جذب کر لیتے ہیں،“

”ان خانوں کے نیچے ایک اور حصہ ہوتا ہے جو ہنیک اسفنج کا سا معلوم ہوتا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ جب قدر پانی، شکر، نشاستہ اور دوسری چیزیں بنکر جو کچھ بچ رہتا ہے، یہ حصہ اسے نکال دیتا ہے اور دوران کو قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔“

”ہمارے ملک ہندوستان میں ایک پودا ہوتا ہے جسکو نیلو فر کہتے ہیں، یہ پودا اندولوں یا جھیلوں میں ہوتا ہے، اس میں دو قسم کے پتے ہوتے ہیں“

”عام طور سے پتے جڑوں سے نہیں نکلتے بلکہ تنے سے، تاہم جب جڑیں ہوا اور روشنی میں آجاتی ہیں تو ان سے کوئیلین نکل آتی ہیں،“

”جیوان مفرد اجزاء سے مرکبات تیار کرنے کے بجائے پیچیدہ اور مرکب غذاؤں کو توڑ پھوڑ کر مفرد بنا دیتا ہے“

غلط تعریفین اور تقسیمین ”آپ پہلے سن چکے ہیں کہ پتے کے اوپر ایک سلسلہ چوٹے چوٹے خانوں کا ہے اور اسکے نیچے ایک سلسلہ سبز خانوں کا، جن میں سبز مادہ بھرا ہوتا ہے، یہی سبز مادہ پودوں کی زندگی کا باعث ہے، یہ مادہ لیسدار ہوتا ہے اور حقیقت میں یہی ابتدائی پودہ ہے، اس سبز مادہ کو علم نباتات کی اصطلاح میں مخضرہ کہتے ہیں“

”مخضرہ جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے، پروٹوپلازم کی ایک خاص قسم ہے“



## مطبوعات پنجاب

گہوارہ تمدن، مولوی نیاز محمد خان صاحب نیاز پختوری کی ایک جدید تصنیف ہے، جس میں اشری تحقیقات، قیاسی نظریات، تاریخی حوالوں اور سفر ناموں سے یہ دکھایا گیا ہے کہ جنس نسوانی نے ازمنہ قدیم میں تہذیب و ارتقاء عالم کا کمان تک ساتھ دیا، اور دنیا کی شائستگی اور مذہبیت کی پیدائش میں اس کا کمان تک حصہ ہے، گھر کی ضروریات اور صنعت و حرفت کی تکمیل میں اس نے کمان تک دنیا میں کام کیا ہے،

اس موضوع پر گوانگریزی میں متعدد تصنیفات ہیں اور ان سے اردو میں ایک کتاب مرتب کر لینا آسان کام ہے، لیکن مولوی نیاز صاحب نے اس کتاب میں قابل داد کوشش و محنت کی ہے، اور ہم ان کے زیادہ ممنون اس بات کے ہیں کہ انھوں نے کم از کم اس کتاب میں اپنی خاص ادبی زبان استعمال نہیں کی ہے، اردو میں یہ مفید اور جدید معلومات امید ہے کہ لوگ دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور مصنف کو فہرست مطلوبات اردو میں ایک نئے باب کے افتتاح پر مبارکباد دیں گے،

مولوی صاحب نے حاشیہ (یا فٹ نوٹ) کی جگہ استدراک کا لفظ جابجا استعمال کیا ہے لیکن باری طرح انکو بھی معلوم ہے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں، اور اسکا صحیح موقع استعمال کیا ہے، جنس لطیف کے مقابلہ میں "جنس کرخت" کا لفظ شاید ہمارے اخوان جنس اپنے لئے پسند نہ کریں،

بہر حال کتاب دلچسپ اور نئے معلومات پر مشتمل ہے، لکھائی چھاپائی عمدہ، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۵۲ صفحہ، قیمت عار مصنف سے تاج محل بھوپال کے پتہ سے طلب کیجئے۔

شہنشاہ کوئٹہ، کلکتہ کے مسلمان طلبہ کو سیرۃ نبوی پر مضمون لکھنے کے لئے ایک انعامی مقابلہ کی

"تری کے پودے کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں مخضرہ ہوتا ہے دوسرا وہ جس میں مخضرہ نہیں ہوتا۔"

"صرف دو قسم کے پھولوں کی تلقیح ہوا کے ذریعہ ہوتی ہے، ایک تو صحرائی درختوں کی دوسرا گہاس کے شکل کے پودوں کی، صحرائی درختوں میں دیودار صنوبر وغیرہ ہیں، اور گہاس کی شکل کے پودوں میں گہون، چنا، جوار، باجرہ، چانول اور بانس وغیرہ۔"

ہمیں امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ان تسامحات کی اصلاح کر دی جائیگی۔

آخر میں ہم پھر اسکا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ اس رسالہ کا طرز بیان ایسے لوگوں کے لئے موزوں بن سکتا ہے جو سائنس پر ابتدائی کتابیں لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔





دعوت دیگئی ہے، تمام طلباء میں حامد نعمانی اعظم گدھی (پریذیسی کانج کلکتہ) کا مضمون سب سے بہتر سمجھا گیا اور انکو جناب راجہ صاحب محمود آباد کے ہاتھ سے ایک تمغہ دیا گیا، یہی مضمون مذکور شہنشاہ کوئین شاہ نام سے شائع کیا گیا ہے،

اس رسالہ میں سیرۃ بنوی کے مختصر واقعات سہل و آسان زبان میں خطیبانہ انداز سے لکھے گئے ہیں، طلبہ اور عام شائقین اسکا مطالعہ کر سکتے ہیں، ضخامت ۱۰۰ صفحے، لکھائی چھپائی کا فخر متوسط قیمت عدد پتہ: حامد نعمانی صاحب نمبر ۱۶ بازار اسٹریٹ کلکتہ،

حقیقت (لکھنؤ) ہندوستان کی اسلامی آبادی میں لکھنؤ کو جو شرف و امتیاز حاصل ہے اس سے کسکو انکار ہو سکتا ہے، ضرورت تھی کہ اس شہر سے جو ملک کی اسلامی آبادی میں دماغ کی حیثیت رکھتا ہے ایک سنجیدہ ابا و قار اور معتدل اخبار جاری کیا جائے، خدا کا شکر ہے کہ لکھنؤ کے چند باپوش اور صحیح الرائے مسلمان ارباب فکر و قلم نے اس ضرورت کو محسوس کیا، اور حقیقت کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۷ء سے جاری کر دیا جو کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے،

یہ اخبار بڑی تقطیع کے ۸ صفحے پر شائع ہوتا ہے، کاغذ، لکھائی، چھپائی سب قابل تعریف ہے، سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ اسکا نصب العین صرف سیاست نہیں، بلکہ علمی تعلیمی معاشرتی اجتماعی اقتصادی غرض ملک و قوم کی زندگی کے ہر شعبے کو ابھارنا اور درست کرنا چاہتا ہے، ہمیشہ میں ایک دفعہ اپنی زبان کی مطبوعات پر نظر کرتا ہے، ہر ہفتہ ملک کے اہم واقعات و حوادث پر تبصرہ لکھتا ہے، برادران وطن کے مساعی جمیلہ سے اپنی قوم کو ہمیشہ آگاہ کرتا رہتا ہے، تعلیم و معاشرت کی اصلاح میں حصہ لیتا ہے، سیاسیات میں اپنی رائے ژرف نگاہی سے قائم کرتا ہے، ہر ناظرین سے ملنے میں کہ وہ اپنی قدر دانی کا اظہار فرمائیں کہ یہ چند روزہ خوش آئند بہار نہ ثابت ہو،

قیمت سالانہ عدد پتہ: دفتر حقیقت، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ،

## مجلد پنجم

ماہ جمادی الاول ۱۳۲۸ء مطابق فروری ۱۹۱۰ء

عدد دوم

## مضامین

شذرات

۸۶ - ۸۲

مسئلہ خلافت

مولوی ابوالحسنات ندوی ۸۸ - ۱۰۵

ہندوستان کے بحری کارنامے

جناب محمد یوسف صدیقی ایم بی اے اراکس ۱۰۶ - ۱۱۳

مسئلہ زر

نشی مقبول احمد صاحب رئیس سندیلہ ۱۱۴ - ۱۲۶

ایران

مولوی محمد سعید صاحب انصاری ۱۲۸ - ۱۳۲

فلسفہ امن

۱۳۳ - ۱۴۱

مسیحی دنیا کا ایک عجیب عقیدہ

۱۴۲ - ۱۴۴

اعلیٰ تعلیم اور طریق املاء

۱۴۴ - ۱۴۶

اخبار علمیہ

۱۴۶ - ۱۵۲

نامہ سرسید

۱۵۵ -

ادبیات

۱۵۶ - ۱۵۷

مطبوعات جدیدہ

۱۵۸ - ۱۶۰

## جدید مطبوعات

سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سوانح عمری انکے مجددانہ کارنامے، بنو امیہ کی تاریخ و طرز سیاست کی تفصیل اور انکے معائب و محاسن کا موازنہ، از مولانا عبدالسلام ندوی، قیمت پچھرا، نمبر ۱۶۰ - ۱۵۸